



آشوبِ آگہی

پروفیسر ڈاکٹر شیخ محمد اقبال

آشوبِ آگہی

(مجموعۂ مضامین)

پروفیسر ڈاکٹر شیخ محمد اقبال
ایم اے انگلش، ایم اے اردو،
ایم فل (گولڈ میڈلسٹ)، پی ایچ ڈی

اشاعت..............................۲۰۰۷ء

تعداد..................................۵۰۰

طابع..............................ثنائی پریس سرگودہا

قیمت..............................۱۵۰روپے

کمپوزنگ..........................مسعود شاہین

سرورق..........................محمد انیس

ناشر..................................پروفیسر ڈاکٹر شیخ محمد اقبال

ملنے کا پتہ:

131۔رحمت پارک یونیوسٹی روڈ سرگودہا

فون:03004489399, 048-3226686

شاہد بخاری

D-651 فیصل ٹاؤن لاہور

042-5161149, 03004855148

انتساب

اپنی لائف بوٹس

کشور اقبال اور کوکب اقبال کے نام

اللہ تعالیٰ

انہیں دن دُگنی اور رات چوگنی

صلابت عطا کرے۔ (آمین)

عرضِ مصنف

23 مارچ 2001ء کو ''کب رات بسر ہوگی'' کا ابتدائیہ تحریر کیا تھا اور ٹھیک چھ سال بعد 23 مارچ 2007ء کو ان چھ برسوں میں تحریر کردہ اداریوں کو Compile کرتے وقت چند معروضات پھر رقم کر رہا ہوں۔ ''کب رات بسر ہوگی '' کے ابتداء ہی میں زندگی کے تلخ حقائق کی بات کی تھی' چھ سال میں جہاں بہت دل خوش کن واقعات رونما ہوئے ، وہاں زندگی کے کئی بھیانک روپ بھی دکھائی دیئے۔ زندگی کی ناہمواریوں ارر مشکلات سے کچھ اور زیادہ معانقہ ہوا لیکن یہ دل، یہ کافر دل نہیں مانا اور مجھے مجبور کرتا رہا کہ میں ان اندھیروں کے خلاف صف آراء ہوں' جو بساء اوقات آنکھ کی بینائی چھین لیتے ہیں اور جسم کو توانائی سے محروم کر دیتے ہیں۔

اپنے مضامین میں جو کہ ماہنامہ ''سفید چھڑی'' کے اداریوں کی صورت میں تحریر ہوئے میں نے حتیٰ المقدور کوشش کی ہے کہ زندگی کے مختلف گوشوں کو اجاگر کروں اور بعض تضادات سے متعلق قلمی جہاد جاری رکھوں۔ جدید تقاضوں کو ملحوظِ نظر رکھتے ہوئے اپنی قلمی استطاعت کے مطابق میں نے کوشش کی ہے کہ میں جہاں تک ممکن ہو سچ بولوں کیوں کہ بالکل سچ بولنا فی الحال ممکن ہی نہیں تاہم میں نے کوشش کی ہے کہ میں مصلحتوں کو بالائے طاق رکھتے ہوئے جو دل کہتا ہے وہی زبان سے کہوں۔ عین ممکن ہے کہ زبان دل کی رفیق نہ ہو سکی ہو اور دل میں جو طوفان ہے اس کی ترجمان نہ بن سکی ہو کیونکہ دل کی دنیا تو سُمندر سے کہیں زیادہ گہری ہوتی ہے، صحراؤں سے زیادہ کشادہ اور آسمانوں سے زیادہ بلند' تاہم جو کچھ بن پڑا ہے کیا ضرور ہے یا کم از کم کرنے کی کوشش کی ہے۔ اگر چہ یہ کرنا لکھنے تک محدود ہے تاہم

بحمداللہ اپنی زندگی میں یہی کوشش کی ہے کہ جو کہوں اس پر عمل بھی کروں اور ایسا ہی کرنے کا ارادہ ہے۔ میرے خیالات سے قارئین کا متفق ہونا ضروری نہیں لیکن میری خواہش ہوگی کہ قارئین ان خیالات پر غور ضرور کریں۔

مضامین کا احاطہ قدرے وسیع ہے' میں نے کوشش کی ہے کہ عصری مسائل کو ہمیشہ ملحوظِ نظر رکھوں اور معروضی انداز سے سپردِ قلم کروں۔ مجھے یہ بھی معلوم ہے کہ جدید دور کی مصروفیات نے انسان کا رشتہ کتاب سے منقطع کر دیا ہے لیکن پھر بھی میں نے کتاب ہی کا سہارا لیا ہے کیوں کہ فی الحال اور مؤثر سہارا دستیاب نہیں اور پھر کتاب پر میرا یقین بھی غیر متزلزل ہے۔ خیالات کی پیش کش کوئی صورت اختیار کر لے سی ڈیز کی صورت میں رونما ہو جائے۔ بہر حال خیالات کی ترسیل ہمیشہ جاری و ساری رہے گی یعنی خیالات مٹ نہیں سکتے ان کی پیش کش کا پیرہن تبدیل ہوتا ہے تو ہوانسان جتنا چاہے لاتعلق ہو جائے مکمل طور پر نہ ماضی سے اپنا تعلق توڑ سکتا ہے نہ حال سے۔ اس لئے انسان کا انسان سے مکالمہ کوئی صورت بھی اختیار کرے، جاری وساری رہے گا۔

قارئینِ کرام میری تحریریں کسی بندھے ٹکے کالم میں نہیں ڈھلیں۔ یہ تو ایک تخلیقی عمل ہے جو اپنی راہ خود اختیار کرتا ہے، شاعری کی طرح' مصوری کی مانند' موسیقی کی صورت' اگر دل کی بات دل تک پہنچ جائے تو کیا کہنے' نہ بھی پہنچے تو کم از کم دل کا غبار تو کچھ چھٹا' یہی کافی ہے۔

اس کتاب کی اشاعت کے حوالے سے میں اپنے بہت سے احباب کا ممنونِ احسان ہوں بالخصوص ڈاکٹر چوہدری احمد حسن اور سید نسیم الغنی کا، لیکن ان کے ساتھ ساتھ میں اپنے بہت سے اور دوستوں کا بھی شکرگزار ہوں جن کی محنت شاقہ کے بغیر کتاب کی اشاعت ممکن نہ ہوتی ان میں اقبال نثار، تنویر احمد، محمد ریاض اور رانا محمد اقبال شامل ہیں۔ میں پروفیسر شاہد اسلام دانش، شاہد بخاری (ایڈووکیٹ) اور عبدالباسط سہیل کا بھی بہت ممنون ہوں کہ

بہت سے مراحل پران احباب نے میرے کام کو آسان بنایا۔

قارئینِ معظم! یہ عمل تا دمِ آخر جاری رکھنے کا ارادہ ہے اگرچہ سب ارادے ہمارے اپنے بس میں نہیں ہوتے لیکن ارادوں کے چراغ جلائے رکھنے میں کیا مضائقہ ہے۔

پروفیسر ڈاکٹر شیخ محمد اقبال

۲۳۔ مارچ ۲۰۰۷ء

فہرست

نرم دم گفتگو

معاشرتی ماحول کا اگر کوئی بیرومیٹر ہو تو پتہ چلے کہ اکثر و بیشتر جگہوں پر درجہ حرارت کھولاؤ کے درجے تک پہنچا ہوا ہے' ایسا لگتا ہے کہ ماحول میں ایک آگ سی لگی ہے' ہر شخص پگھلا جا رہا ہے اور کئی مقامات ایسے بھی ہیں جہاں درجہء حرارت نقطہء انجماد تک پہنچ گیا ہے۔ وہ سرد مہری ہے کہ الامان والحفیظ۔ کسی کی آخری ہچکی کسی کے لئے دل لگی کا سامان فراہم کر رہی ہے' کوئی چیخ رہا ہے' چلاّ رہا ہے تو کسی کو اس کا احساس تک نہیں' یہ دونوں صورتیں انتہائی تکلیف دہ ہیں اور دونوں میں خود غرضی' خود ستائی اور خود پرستی کی کارفرمائیاں ہیں۔ ہر شخص اپنے آپ کو ہمہ داں اور ہمہ بیں سمجھنے لگتا ہے۔ جو کچھ وہ کہہ رہا ہے وہی سچ ہے' آخری سچ' دوسرے کو کچھ معلوم ہی نہیں۔ بات کرتے وقت کچھ اس طرح جوش و خروش کی کیفیت پیدا ہوتی ہے جیسے پوری کائنات میں وہی شخص بول رہا ہو صرف بولنے کا حق' دلائل دینے کا حق' سمجھانے اور نصیحتیں کرنے کا حق اسے ہی ملا ہے۔ سارے جہان کی معلومات اسی کو حاصل ہیں اور اگر یہ کیفیت کہنے اور سننے والے دونوں میں پیدا ہو جائے تو پھر نقشہ ہی بدل جاتا ہے۔ ایک شخص دوسرے کی سنتا نہیں' بس سناتا ہے اور سناتا چلا جاتا ہے۔

گفتگو کا مفہوم یہ ہے کہ دو یا دو سے زیادہ اشخاص ایک دوسرے کے ساتھ بات چیت میں منہمک ہیں' سنتے بھی ہیں اور سناتے بھی' کہتے بھی ہیں اور کہنے بھی دیتے ہیں۔ لیکن ہمارے اسی ماحول میں جس پر جلدی کے آسیب کا اثر ہے بس کچھ نہ کچھ بلکہ سب کچھ کہہ دینے کی خواہش ہی زندگی کی آخری خواہش محسوس ہوتی ہے۔ ممکن ہے کہنے والے کی تشفی ہو رہی ہوتی ہو مگر سننے

والے کے اعصاب جواب دینے لگتے ہیں۔ اس کا دم گھٹنے لگتا ہے اور یوں معاشرتی درجۂ حرارت میں اضافہ ہونے لگتا ہے۔ نفسیاتی عوارض لاحق ہونے لگتے ہیں، بات دھینگا مشتی تک پہنچ جاتی ہے بلکہ دہشت گردی کی بعض صورتیں پیدا ہونے لگتی ہیں۔ مہذب معاشرے کہنے اور سننے میں فرق ملحوظ رکھتے ہیں، کہتے ہیں تو سنتے بھی ہیں۔ ایک کہہ رہا ہوتا ہے تو دوسرا ہمہ تن گوش ہوتا ہے بلکہ کہنے والا سننے کے لئے ہمیشہ آمادہ رہتا ہے کہ یہی شائستہ اسلوب گفتگو ہے۔ لیکن ہماری دنیا میں یہ اسلوب ابھی متعارف نہیں ہوا۔ ہمارے ہاں ہر کوئی کہہ چکنے، سب کچھ کہہ چکنے کے روگ میں مبتلا ہے اور لمحوں میں صدیوں کے قصے بیان کر دینا چاہتا ہے، سننا نہیں چاہتا، کسی کو ملتا ہے یا ٹیلی فون پر محو گفتگو ہوتا ہے تو تکلفاً کہتا ہے ''کہو کیسے ہو'' اور پھر اس کا انتظار نہیں کرتا کہ اس سے سوال کا جواب بھی لینا ہے بلکہ اپنی کتھا بیان کرنا شروع کر دیتا ہے اور پھر بیان کرتا چلا جاتا ہے۔ آپ اسے ڈرامائی اصطلاح میں Monologue کہہ سکتے ہیں یا پھر Soliloquy بھی یعنی خود کلامی۔ جب گفتگو کرنے والا صرف اپنے آپ سے محو کلام ہوتا ہے اور اس کے پاس کوئی نہیں ہوتا اور اگر ہو بھی تو وہ اسے یہ تصور کر لے کہ وہ ہے ہی نہیں تو اس صورت میں بھی ایسا کلام خود کلامی ہی تو ہوگا۔ اس میں کلام نہیں کہ بات کرنے سے دل کا بوجھ ہلکا ہو جاتا ہے۔ catharsis کی صورت پیدا ہوتی ہے لیکن اگر کسی ایک کی catharsis سے بہت سوں میں ہیجان پیدا ہو تو ماحولیاتی درجہ حرارت میں کوئی کمی پیدا نہیں ہوگی، دلوں کی الجھنیں بڑھتی رہیں گی، غلط فہمیاں جنم لیتی رہیں گی، حقیقت یہ ہے کہ عام زندگی میں ہم گفتگو کر رہے ہوتے ہیں، لیکچرز نہیں دے رہے ہوتے، تقاریر نہیں پڑھ رہے ہوتے، یہ فرق مہذب معاشروں میں ہمیشہ ملحوظِ خاطر رکھا جاتا ہے لیکن ایسے معاشروں میں جہاں سماجی رویئے مہذب نہ ہوتے ہوں، جہاں شائستگی نے اپنا رنگ و نور نہ پھیلایا ہو وہاں کہنے اور کہتے رہنے کی خواہش بھیانک صورت اختیار کر لیتی ہے۔ انسان معاشرتی حیوان ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ وہ مل جل کر زندگی گزارنے پر مجبور ہے اور مل جل کر زندگی گزارنے کے لئے ضروری ہے کہ کچھ کہا جائے،

کچھ سنا جائے' کچھ سمجھا اور سمجھایا جائے' دلائل و براہین کی روح' محبت' خلوص اور چاہت ہو' کوشش یہ ہو کہ محبت پھیلے' افہام و تفہیم جنم لے' وہ نرم خوئی اور نرم گفتاری پیدا ہو جو مومن کا طرۂ امتیاز ہے' جو اسے غیر مہذب اقوام سے ممیز و ممتاز کرتا ہے' ایسی صورت میں ماحولیاتی درجہ حرارت معتدل ہو جاتا ہے بلکہ خوشگوار ہوا کے ٹھنڈے جھونکے جان بخش ہونے لگتے ہیں اور ہر طرف محبتوں کا ایک سیل بے پایاں امنڈنے لگتا ہے' اور ہمیں ہر کوئی اپنا سا لگنے لگتا ہے' اپنی ذات کا حصہ' اپنی روح کی آواز کیونکہ سب مل کر ہی ایک زندگی کو جنم دیتے ہیں۔ زندگی ایک اکائی ہوتی ہے' ذرا سی تکلیف پورے وجود کو متاثر کرتی ہے اور ذرا سی خوشی پورے وجود کو تسکین دیتی ہے۔ یہ پورا وجود مہذب معاشروں کی روح رواں ہوتا ہے ایسی صورت میں خود غرضی' خودستائی جنم نہیں لیتی' بے حسی دم توڑ دیتی ہے' کسی کی ذرا سی تکلیف پر پورا معاشرہ حرکت میں آ جاتا ہے، ایک مجبور کی آواز سن کر کوئی محمد بن قاسم ہزاروں میل کا فاصلہ طے کر لیتا ہے' کوئی خلیفہ راتوں کو دکھ درد بانٹنے کے لئے گلی کوچوں میں گھومتا ہے اور ایسی صورت میں ایک سچا اور اچھا معاشرہ تشکیل پاتا ہے۔ یہ معاشرہ باہمی جذبات و احساسات کا خیال رکھتا ہے۔ ہر فرد یہ محسوس کرنے لگتا ہے کہ کہیں اس کے حرف اور قول سے کسی کی دل آزاری تو نہیں ہو رہی۔ اس کے منہ پر please, Excuse me, sorry وغیرہ الفاظ ہوتے ہیں وہ بات کرنے سے پہلے کئی بار سوچتا ہے۔ کوئی غلطی سرزد ہو جائے تو ہمہ وقت معذرت کے لئے تیار رہتا ہے اور کسی کو ذرا سی زحمت بھی دینی ہو تو اس کے لئے انتہائی شائستہ الفاظ استعمال کرتا ہے ''اگر آپ کو زحمت نہ ہو تو یہ اخبار مجھے دے دیں' یا' اگر آپ محسوس نہ کریں تو عرض کروں، معذرت چاہتا ہوں میں نے آپ کو زحمت دی'' اور یہ الفاظ صرف الفاظ نہیں ہوتے بلکہ ان میں خون جگر شامل ہوتا ہے اور اسی طرح معاشرے کا درجہ حرارت نہ تو کبھی کھولاؤ کے درجے تک پہنچتا ہے اور نہ ہی نقطۂ انجماد تک بلکہ انتہائی خوشگوار پر بہار اور پر مسرت رہتا ہے اور زندگی کی تمام خوشیاں' تمام راحتیں اور مسرتیں ہمارے سامنے ڈھیر ہو جاتی ہیں اور زندہ رہنے کی خوشگوار جگہ بن جاتی ہے۔ اور پھر یوں

لگنے لگتا ہے کہ کوئی کہتا چلا جائے' کوئی سنتا چلا جائے' زندگی کی دلکش کہانی کچھ ان کی اور کچھ ہماری زبانی کہ یہی مہذب' شائستہ اور ترقی یافتہ اقوام کا اسلوبِ حیات ہے۔

وہ دن گئے کہ کہتے تھے نوکر نہیں ہوں میں

نوکر ہونے کی خوشی شاعروں کے شاعر اسد اللہ خان غالبؔ کو بھی ہوئی تھی، وہ بھی چاہتے تھے کہ انہیں کوئی مصروفیت میسر آئے اور وہ بھی حاجات زندگی سرانجام دے سکیں، یہ الگ بات کہ جب کالج کے دروازے پر کالج کا پرنسپل ان کے استقبال کے لئے نہیں آیا تو وہ سیخ پا ہو گئے اور کالج میں ملازمت کے تصور ہی کو خیر باد کہہ دیا، ایسا تو صرف غالبؔ ہی کر سکتے تھے، ہمارے دور میں تو یہ بالکل ممکن نہیں۔ اگر کہیں ملازمت کا ذرا سا امکان دکھائی دینے لگتا ہے تو ہم پھولے نہیں سماتے۔ ایسا لگتا ہے کہ زندگی کے سارے مسئلے حل ہو جائیں گے اور ہم ہشاش بشاش زندگی گزارنے لگیں گے، یہ الگ بات کہ ملازمت حاصل کرتے ہی افسردگی جنم لینے لگتی ہے اور ہم ترقیوں اور سکیلز کے خواب دیکھنے لگتے ہیں اور یوں حسرتیں جنم لینے لگتی ہیں۔ یہ سچ ہے کہ بے روزگاری کی موجودہ صورت حال تیس چالیس سال پہلے نہ تھی، ملازمت مل ہی جایا کرتی تھی، بعض مواقع پر تو ایسا بھی ہوتا تھا کہ ملازمتیں زیادہ ہیں اور امیدوار کم، کہیں کہیں تو پڑھے لکھے اور ہنر یافتہ اشخاص کی تلاش بھی ہوا کرتی تھی لیکن پھر کچھ یوں ہوا کہ لوگ ڈگریاں حاصل کرنے لگے اور پھر ڈگریاں ہی ڈگریاں ہاتھوں میں دکھائی دینے لگیں۔ ان ڈگریوں کے ہمراہ اکثر و بیشتر تعلیمی استعداد اور قابلیت سرے سے ہونا ہی بند ہوگئی۔ نوجوانوں اور ان کے سرپرستوں نے عام طور پر ڈگریوں کے حصول کو ہی مطمع نظر بنالیا اور ہماری تیسری دنیا میں کسی شئے کا حصول چنداں دشوار بھی نہیں بشرطیکہ دام پاس ہوں جس سے ہر شئے ممکن ہے، ہر شئے خریدی جا سکتی ہے کیونکہ اشیا چاندی کے ترازو میں تلتی ہیں۔ ایسے میں ڈپلومے اور ڈگریوں کا حصول کیونکر مشکل ہوگا۔ لیکن مشکل اس وقت پیش آنے لگی جب افراط زر کی طرح افراط اسناد

بھی وقوع پذیر ہوئی۔ ملازمتیں نہیں تھیں' ڈگریاں ہی ڈگریاں تھیں اور اگر ملازمتیں تھیں بھی تو ڈگریوں کے ہمراہ قاضی الحاجات، دام و درہم کا ہونا ضروری قرار پایا' یا مسند نشینوں کا منظور نظر ہونا ناگزیر ہو گیا۔ اس طرح قابلیت اور استعداد کی ضرورت اور بھی کم ہو گئی اور پھر نوٹوں کی طرح ڈگریاں بھی دن رات چھپنے لگیں اور بکنے لگیں۔

اس میں کلام نہیں کہ کچھ نوجوان سچ مچ تعلیم کی اہمیت کو تسلیم کرنے لگے اور انہوں نے دن رات ایک کر کے تعلیم حاصل کی لیکن وہ تعلیم ایسی تھی جو شعور و آگہی تو عطا کرتی تھی لیکن عملی طور پر کچھ کرنے کے قابل نہیں بناتی تھی۔ ایم اے کر لینا اعلیٰ تعلیم یافتہ تو بنا دیتا تھا لیکن اس سے نہ کوئی مشین چلانا آتی تھی اور نہ کوئی مشین بنانا۔ سائنسی اور تکنیکی تعلیم کی طرف رجحان بہت دیر میں پیدا ہوا اور جن حضرات نے ان میدانوں میں اپنی صلاحیتوں کا اظہار کیا وہ اقتصادی طور پر خوشحال بھی ہوئے۔ وقت کے ساتھ ساتھ صورتحال نے ایک اور کروٹ لی' جگہ جگہ یونیورسٹیاں اور کالج بننے لگے۔ طالبات بھی میدان میں کود پڑیں اور کئی شعبوں میں بلکہ بہت سے شعبوں میں مردوں کو پچھاڑ دیا۔ پھر کیا تھا' ملازمتیں کم' ملازمتوں کے خواہش مند زیادہ' امید کے دیئے ماند پڑ گئے' ناامیدی کے اندھیرے پھیلنے لگے۔

لیکن ذرا ٹھہریئے! ذرا سوچیئے کہ ملازمتوں سے ہماری مراد کیا ہے' کیا ان سے مراد سرکاری ملازمتیں ہیں' اگر ایسا ہے تو یہ ممکن ہی نہیں کہ سرکاری شعبے میں تمام تعلیم یافتہ نوجوانوں کو جگہ مل سکے کیونکہ حکومت کی طرف سے خدمات سرانجام دینے کے لئے آخر کتنے اشخاص کی ضرورت ہوگی۔ اگر خدمت کرنے والے زیادہ ہو جائیں تو وہ کس کی خدمت کر رہے ہوں گے۔ خدمت گزاروں کی تعداد اگر ایک فیصد ہو تو بھی بہت زیادہ ہوگی' اس لئے سرے سے یہ تصور کہ حکومت کی طرف سے خدمات سرانجام دینے کو ہی ملازمت کہا جائے بالکل غلط ہوگا۔ ملازمت کا یہ تصور دنیا کے کسی حصے میں پھل پھول نہیں سکا۔ حکومت کے ساتھ بہت سی خدمات خود عوام کو سرانجام دینا ہوتی ہیں' عوام ہی عوام کے لئے ملیں' کارخانے' کالج' سکول' ہسپتال'

سڑکیں اور پل بناتے ہیں، صنعتی، تجارتی اور زرعی منصوبے تیار کرتے ہیں اور عملی جامہ پہناتے ہیں۔ لیکن ہمارے ملک میں بعض حکومتوں کی ناعاقبت اندیشی کے باعث اور عوام الناس کے ملّی شعور کے فقدان کی وجہ سے ایسا ممکن نہیں ہو سکا۔ افراد کو جو سرمایہ کاری ملک کے اندر کرنا تھی وہ ملک سے باہر کی۔ ایک حکومت نے دوسری حکومت کے منصوبوں کو غلط قرار دیا اور غلط اور صحیح کی تعبیروں نے تقدیریں رقم کرنا شروع کر دیں۔۔۔ تیرہ و تار تقدیریں۔۔۔ مایوس کن تقدیریں۔۔ حرماں نصیبیاں۔۔ پریشان حالیاں۔

ہماری رائے میں جو شخص پیدا ہوتا ہے اللہ نے اگر اسے ایک منہ دیا ہے تو دو ہاتھ بھی دیئے ہیں اور دو ہاتھوں کو حرکت دینے کے لئے دماغ بھی۔ اگر ہماری قوم کا ہر فرد اپنی صلاحیتوں سے آگاہ ہو جائے تو ہماری رائے میں بے روزگاری کا مسئلہ سرے سے پیدا ہی نہ ہو۔ اولاً تو یہ کہ اللہ تعالیٰ ڈھونڈنے والوں کو دنیا بھی نئی دیتے ہیں۔ ثانیاً ملازمت کے لئے کرسی اور میز کا ہونا ضروری نہیں، آپ زمین پر بیٹھ کر، کھیتوں میں جا کر، گلیوں میں گھوم کر، گھروں میں بیٹھ کر بھی اپنے آپ کو اقتصادی طور پر خوشحال بنا سکتے ہیں، ضرورت اس امر کی ہے کہ محنت کی عظمت کو تسلیم کیا جائے۔ ایک پاکستانی اگر بیرون ملک جا کر ڈش واشنگ کر سکتا ہے تو اپنے ملک میں یہ ممکن کیوں نہیں، کیونکہ بیرون ملک خود ملک والے بھی یہی کام کر رہے ہوتے ہیں اگر انہیں ہاتھ کے کام سے کوئی ہچکچاہٹ محسوس نہیں ہوتی تو ہمارے اہل وطن کو ایسا محسوس کیوں ہوتا ہے۔ رویوں کے بدلنے کی ضرورت ہے اور اگر رویئے تبدیل ہو جائیں تو بے روزگاری کا مسئلہ بڑی حد تک حل ہو جائے گا۔

ہمارے ملک میں نہ تو صلاحیتوں کی کمی ہے اور نہ ہی ذرائع کی، یہاں باصلاحیت لوگ بہت کچھ کر لیتے ہیں۔ ادویہ تیار کرتے ہیں، کپڑا بناتے ہیں، مشینیں تیار کرتے ہیں اور جانے کیا کیا، لیکن بدقسمتی یہ ہے کہ وہ رات ہی رات میں دولت مند بن جانا چاہتے ہیں، ذرا ان کی مصنوعات بکنے لگیں، انہوں نے ان کی کوالٹی کو کم کرنا شروع کر دیا، نمبر ٹو اور نمبر تھری مصنوعات

تیار ہونے لگیں، ابتداً پائیدار شئے ناپائیدار ہوگئی، نتیجتاً خریدنے والے کو ملک میں تیار کردہ اشیاء پر کوئی اعتبار ہی نہ رہا اور پھر نتیجہ یہ نکلا کہ رات ہی رات میں رئیس ہونے کے خواب دیکھنے والے کنگال ہوگئے اور ساتھ ہی ملک بھی کنگال ہوگیا۔

بے روزگاری کا رونا رونے والے ان کو روئیں جوان کے رونے کا سامان بنے ہیں، وہ جنہوں نے وطن عزیز میں نہ صنعت کو فروغ دیا اور نہ تجارت کو، جنہوں نے ملک سے باہر بستیاں بسائیں اور اپنے حال و مستقبل کے ایوان تعمیر کئے۔ ملک سے بے روزگاری اس وقت تک ختم ہونا ممکن ہی نہیں جب تک کہ ہم خود اپنے آپ سے، اپنے گھر سے، اپنے محلے سے، اپنے بھائیوں بہنوں سے مخلص نہیں ہوں گے، ہم اپنے قزاق خود ہیں، ہم خود اپنے گھروں میں نقب لگاتے ہیں اور خود ہی ایف آئی آر درج کروانے چلے جاتے ہیں، کتنا بڑا مذاق ہے اپنے آپ سے اور اپنی پوری قوم سے ہم کب تک یہ مذاق کرتے رہیں گے اور مذاق سہتے رہیں گے، ہمیں اپنے گریبان میں جھانکنا ہوگا۔

آئی ایم ایف، ورلڈ بنک اور سپرز پاور پر الزام تراشی کرنے کی بجائے اپنے وڈیروں، ساہوکاروں اور سیاست کے کھلاڑیوں کا قبلہ درست کرنا ہوگا اور یہ اسی وقت ممکن ہے کہ ہم آغاز اپنی ذات سے کریں، اپنے بچوں کو درست تعلیم دیں، ایسی تعلیم بھی دیں جو پیٹ بھرنے کا سبب بھی بنے۔ ہر بچے کو ڈاکٹر، انجینئر اور سول سرونٹ کے خواب دکھانے کی بجائے انہیں اس زیور تعلیم سے آراستہ کریں جو کھرے سونے سے بنا ہو۔ ہر چمکنے والی چیز سونا نہیں ہوتی، ہر کرسی نشین ہی باعزت نہیں ہوتا۔ ہر وہ ہاتھ جو کوئی مثبت کام کرتا ہے بھی قابل تکریم ہوسکتا ہے۔ ہم یہ احساس بھی اجاگر کریں کہ رات بھر میں امیر ہونے والا شخص تن تنہا امیر ہوکر کیا کرے گا۔ اس کے چاروں طرف کی چیخیں ایک دن اتنی بلند ہوں گی کہ اس کی راتوں کی نیند اور دن کا چین اڑ جائے گا۔ تاریخ اس امر کی شاہد ہے کہ فرانس، روس اور چین میں جو کچھ ہوا اس سے کون واقف نہیں، لیکن جس انداز سے یہ ہوا اگر ایسا ہی ہونا ہو تو یہ اچھا نہیں ہوگا۔ اچھی چیز وہی ہوتی ہے جو

باہمی تعاون، افہام وتفہیم، منصوبہ بندی قومی اورملی جذبے کے تحت ہو۔ اگر ہم اپنے نوجوانوں کی صلاحیتوں سے استفادہ کرنا چاہتے ہیں تو ہمیں اپنے ذرائع کو مجتمع کرنا ہوگا اور ایک قومی سوچ کو پروان چڑھانا ہوگا۔ بحمداللہ پاکستان اسلام کی سرزمین ہے کم ازکم اسے حاصل اسی مقصد کے لئے کیا گیا تھا۔ اسلامی تعلیمات کے مطابق استحصال کی کوئی صورت ممکن نہیں، امیر اور غریب میں تفاوت کا کوئی بھی تصور اسلامی روح کے برعکس ہوگا۔ ابھی وقت باقی ہے، ابھی صورت حال اس قدر خراب نہیں ہوئی کہ واپسی کا راستہ ہی نہ ہو، لیکن اگر ہم اپنے ضمیروں کو بیدار نہ کر سکے تو تاریخ ہمیں کبھی معاف نہیں کرے گی اور ہم فطرت کے اصولوں کے عین مطابق قصئہ پارینہ بن جائیں گے۔

کامیاب زندگی کا نصب العین

زندگی ایک بار ملتی ہے' زندگی کی کامیابی اور ناکامی کا انحصار اس پر ہے کہ ہم اسے کس طرح گزارتے ہیں یا یہ کہ یہ کس طرح گزرتی ہے کیونکہ اسلوب حیات کے ہم تنہا ذمہ دار نہیں ہوتے' بے شمار عوامل ہمیں متاثر کرتے ہیں' ہماری راہیں متعین کرتے ہیں اور ہماری سوچ اور عمل کو مہمیز کرتے ہیں اس لئے یہ کہنا درست ہوگا کہ ہم جس قدر چاہیں آزاد ہونے کے دعوے کرلیں ہم پھر بھی آزاد نہیں ہوتے' ویسے تو تقدیر کے فلسفے کے تحت ہم بالکل ہی آزاد نہیں ہوتے' ہمارا ہر عمل اور قول ایک بڑی طاقت کا رہین منت ہوتا ہے جس کی مشیّت کے بغیر پتا بھی نہیں ہل سکتا لیکن ہماری رائے میں اسلامی نظام حیات کی اساس عمل ہے اور عمل ایک آزادانہ فیصلے کا رہین منت ہوتا ہے اگر سب کچھ پہلے ہی سے متعین ہے تو پھر بقول شاعر

ے ناحق ہم مجبوروں پر یہ تہمت ہے مختاری کی
چاہتے ہیں جو آپ کریں ہیں ہم کو عبث بدنام کیا

یا پھر

ے لائی حیات آئے' قضا لے چلی چلے
اپنی خوشی نہ آئے نہ اپنی خوشی چلے

لیکن ہماری رائے میں ہم لاکھ اپنی خوشی سے نہ آئے ہوں اور نہ اپنی خوشی سے جانے پر تیار ہوں لیکن اس درمیانی عرصہ میں عمل کے ہم ذمہ دار ہیں' تبھی تو یوم حساب کی ضرورت پیش آئی اور ہر اچھے برے عمل کا فیصلہ کرنے کی تنبیہہ کی گئی' اگر ہم مجبور ہیں تو پھر ہم سے حساب کیسا؟

ہم بے شک اپنے عمل میں آزاد سہی لیکن ہم اتنے بھی آزاد نہیں جتنا کہ کبھی ہم اپنے

آپ کو سمجھ بیٹھتے ہیں' ہماری فکر کے سانچے ہمارا معاشرہ تیار کرتا ہے' وارثت اور ماحول کے عناصر بڑے جابر ہوتے ہیں' ہمارے لئے راہیں متعین کرتے ہیں' ہمارے ہاتھوں میں ایک شیڈول تھما دیتے ہیں۔ امریکن اس لئے امریکن ہے کہ وہ وہاں پیدا ہو گیا' پاکستانی اس لئے پاکستانی ہے کہ اس کی پیدائش پاکستان میں ہوئی۔ اگر ایک کچھ فیصلے خود کر سکتا ہے اور دوسرا نہیں کر سکتا تو اس میں اس کی کیا بہادری اور بزدلی ہوئی' امریکن لڑکی بہت سے کام کر سکتی ہے' بہت سے فیصلے کر سکتی ہے اس لئے نہیں کہ وہ بہت نڈر اور بہادر ہے بلکہ اس لئے کہ وہ ایسے ماحول میں سانس لے رہی ہے جہاں وہ اپنے مستقبل کو بڑی حد تک تراشنے میں آزاد ہے۔ اسلام آباد' لاہور اور کراچی میں رہنے والی لڑکی یا لڑکا پاکستان کے دور دراز علاقوں میں رہنے والے لڑکے اور لڑکیوں کے مقابلے میں بہت سے فیصلے خود کر سکتا ہے۔ جو بات ایک گاؤں اور قصبے میں مجرمانہ ہے وہ بڑے شہر میں ایک لڑکے اور لڑکی کا حق ہے' بس حقوق و فرائض کی نوعیت کا فیصلہ ماحول کو حاصل ہے اور ان موروثی اثرات کو بھی جس سے بچنا بڑی حد تک مشکل ہے لیکن اس میں کلام نہیں کہ ایسے منچلے ہر جگہ موجود ہیں جو اپنے دل کی مانتے ہیں' اپنے ضمیر کی سنتے ہیں' اپنی روح کی پکار پر لبیک کہتے ہیں خواہ اس کے لئے انہیں سر کی بازی لگانی پڑے اور زندگی ہی سے ہاتھ دھونے پڑیں اور ان منچلوں کے باعث ہی زندگی میں تحرک رہا ہے۔ زندگی آگے کی جانب بڑھتی رہی ہے' کسی صورتحال کو کسی ایک لفظ میں بیان کر دینا ہمیشہ مشکل رہا ہے۔ زاویہ ہائے نظر اس قدر مختلف رہے ہیں کہ کسی ایک صورت حال کو ہمہ گیر قرار دینا بہت دشوار ہے۔ رسل نے کہا تھا کہ "گناہ جغرافیائی عمل ہے"

کسی عمل کو ہوا کی مرضی
گناہ لکھ دے ثواب لکھ دے

گناہ و ثواب کی آنکھ مچولی ہمیشہ جاری رہی ہے' کبھی جو چیز انتہائی ناپسندیدہ تھی'

وقت کے ساتھ ساتھ پسندیدہ ٹھہری' یوں کسی صورت حال کولفظوں کی بوتل میں بند کرنا ممکن ہی نہیں' یہی حال لفظ'' کامیابی'' کا ہے۔ کامیاب کون ہے' کون نا کام ہے یہ فیصلہ بھی بڑی حد تک ماحول ہی کرتا ہے لیکن یہ سچ ہے کہ ہم سب کامیاب زندگی گزارنا چاہتے ہیں۔ چاہے وہ ہمارے اپنے سیاق وسباق ہی میں ہو۔ ہم چاہتے ہیں کہ کوئی ہمیں کامیاب کہے' ہمیں خوشحال جانے' ہماری تعریف کرے' ہماری مدح وستائش کرے یہ بنیادی انسانی کمزوری ہے۔ ہم لاکھ یہ کہتے پھریں کہ ہمیں ستائش پسند نہیں' تعریف قبول نہیں' لیکن دل ہی دل میں تعریف سن کرلڈو پھوٹنے لگتے ہیں۔ اس میں شک نہیں کہ اگر ہم اپنی بے جا تعریف پر خوش ہونے لگیں اور محض مدح و ستائش پر سر دھننے لگیں' خود احتسابی سے کام نہ لیں تو ہم زندگی کی دوڑ میں بہت پیچھے رہ جائیں گے اور ہم سچ مچ کی کامیابی اور سچ مچ کی تعریف کی خوشی سے محروم ہو جائیں گے۔

بہرکیف معاشرتی حوالوں سے سہی ہم سب کامیاب زندگی گزارنا چاہتے ہیں۔ پاکستانی معاشرے کے سیاق وسباق میں کامیاب وہ ہے جو دولت مند ہے جس کا کہا مستند ہوتا ہے' جس سے کوئی خوفزدہ ہوتا ہے' جو زندگی کی بہت سی آسائشیں خرید سکتا ہے بلکہ دعاؤں تک کی قیمت اس کی جیب میں ہوتی ہے۔

وہ جتنی چاہے دعائیں خرید سکتا ہے

غریب قرار دے گا کیونکہ امارت کا تعلق دولت ہی سے نہیں بلکہ اس میں کچھ اور عوامل اور عناصر بھی شامل ہیں' ایک شخص بہت امیر ہے مگر رات کی پر سکون نیند بھی اسے میسر نہیں' اس کے دستر خوان پر طرح طرح کی نعمتیں موجود ہیں لیکن وہ کچھ بھی کھا نہیں سکتا' اس کی تعریفوں سے اخبارات بھرے پڑے ہیں لیکن ان تعریفوں کو خود نہیں پڑھ سکتا۔ بہر کیف کامیاب زندگی کی کوئی تعریف شائد ہمہ گیر نہ ہو' ایک مکتبہء فکر کا خیال ہے کہ جو جس قدر زیادہ پر سکون زندگی گزار رہا ہے اسی قدر کامیاب ہے' مگر ایک مکتبہء فکر کے مطابق خالی خولی سکون کس کام کا' جب زندگی کی بنیادی سہولتیں ہی میسر نہ ہوں۔ سوال پیدا ہوتا ہے کہ زندگی کی بنیادی ضروریات ہیں کیا؟ کسی کے نزدیک ایک سائیکل زندگی کی بنیادی ضرورت ہے تو دوسرے کے نزدیک کار' کوئی دال روٹی کو بنیادی حاجت قرار دیتا ہے تو کسی کے نزدیک White meat زندگی کی بنیادی ضرورت ہے۔ اس صورتحال میں کامیابی کی کون سی تعریف آفاقی ہوگی۔ ہماری رائے میں جس ماحول میں ہم رہتے ہیں اگر ہم اس کے غلام نہیں اور نہ ہی سو فیصد باغی' تو شائد ایک حد تک ہم کامیاب ہوں۔ اگر ہم ماضی' حال اور مستقبل کو ایک اکائی گردان لیں تو ہماری زندگی کامیابیوں سے بہرہ ور ہو سکتی ہے۔ ماضی نے جو کچھ ہمیں دیا سب کچھ غلط نہیں' حال کے پاس جو کچھ موجود ہے وہ سب کچھ درست نہیں' اللہ نے ہمیں فکر جیسی دولت سے نوازا ہے اور اگر ہم ماضی و حال کے امتزاج سے اچھی راہیں تراش سکتے ہیں تو ہم بڑی حد تک کامیاب ہیں۔ ہم حال ہیں لیکن کل ہمیں ماضی بنا دے گا۔ ہم بے کار نہیں' جس حد تک ہم کارآمد ہیں اس حد تک ہم سے کام لیا جانا چاہیے، یہی مطالبہ ماضی کا حال سے ہے اور حال کا مستقبل سے۔ اگر ہم کامیاب زندگی گزارنا چاہتے ہیں تو ہمیں زندگی کی تمام خوشیاں سمیٹنے کا جنون ترک کر دینا چاہیے۔ چاند اگر ایک ہے تو اسے کسی ایک کی جھولی میں آ گرنے سے بات نہیں بنے گی' چاند کو چمکنے دیجئے تا کہ ہر ایک اس کی روشنی سے استفادہ کر سکے۔ اگر وہ صرف آپ کا ہو گیا تو باقی لوگ اندھیرے میں ڈوب جائیں گے اور اگر کسی اور نے اس پر قبضہ جما لیا تو اندھیرے آپ کا مقدر بن جائیں

گے۔ چاند کو اپنی مسند پر ہی براجمان رہنے دیجیئے' ہواؤں کو مقید مت کیجیئے ان پر ہر ایک کا حق ہے' خوشبو کی ہر ایک کو خواہش ہے' پانی سے ہر کوئی اپنی پیاس بجھانا چاہتا ہے۔ ہر کوئی اپنی بھوک مٹانا چاہتا ہے' کامیاب انسان وہ ہے جو خود جینے کا اہتمام بھی کرے اور دوسروں کی زندگیوں پر اپنی اجارہ داری بھی قائم نہ کرے' جیئے اور جینے دے۔ اگر اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ ہے تو وہ دوسروں کو بھی مسکرانے دے' وہی مسکرانے والا شخص اس کے مقابلے میں کم کامیاب ہے جو سب کے ساتھ مل کر مسکراتا ہے' کامیابی اور ناکامی اضافی اصطلاحات ہیں۔

مری شکست اضافی سی بات ہے یارو
جو کامیاب ہیں کچھ ایسے کامیاب نہیں

بعض جگہ تو ہار جیت بن جاتی ہے از خود ہارنے کو جی چاہتا ہے اور ہار میں جیت پوشیدہ ہوتی ہے۔

یہ بازی عشق کی بازی ہے جو چاہو لگا دو ڈر کیسا
گر جیت گئے تو کیا کہنا' ہارے بھی تو بازی مات نہیں

کچھ لوگوں کی ہار پر زندگی کی جیت کی بنیاد استوار ہوتی ہے

ع ''کہ خونِ صد ہزار انجم سے ہوتی ہے سحر پیدا''

کامیاب زندگی وہ زندگی ہے جو زندگی کو جنم دیتی ہے' اصل خوشی وہ ہے جس سے خوشیاں پھوٹتی ہیں' اصل محبت وہ ہے جس سے شاخِ حیات پر چاہتوں کے پھل پھول نمودار ہوتے ہیں۔ اگر آپ تنہا کامیاب ہیں تو آپ جیسا ناکام شخص شاید کوئی اور نہ ہوگا۔

حیات لے کے چلو ' کائنات لے کے چلو
چلو تو سارے زمانے کو ساتھ لے کے چلو

سارے زمانے کو آپ اس وقت ہی ساتھ لے کر چل سکتے ہیں جب آپ چلنا

جانتے ہوں، جب آپ کے پاؤں میں تحرک ہو اور جذبوں میں تازگی ہو، جب آپ دوسروں کو معاف کر دینا جانتے ہوں، جب آپ اپنے ضمیر کے کٹہرے میں اپنے خلاف بھی فیصلے دے سکتے ہوں، جب آپ اجارہ دار ہونا بند کر دیں، جب آپ میں مل جل کر رہنے کی صلاحیت پیدا ہو جائے، جب آپ شکسپیئر کی طرح دوسروں پر ہنسنے کی بجائے دوسروں کے ساتھ ہنسنے کی صلاحیت پیدا کر لیں، جب آپ اپنی مرضی سے ایک پیاس کو اپنے ساتھی کے ساتھ بانٹ سکیں، جب آپ العطش کی آواز سن کر اپنے لبوں سے پانی کا گلاس ہٹا لیں، جب آپ فاتح مکہ کی طرح کہہ سکیں ''آج کسی کو ڈرنے کی ضرورت نہیں آج سب کو معاف کر دیا گیا ہے''، جب آپ گناہ گار سے نہیں گناہ سے نفرت کرنا سیکھیں، گناہ گار کو سینے سے لگا کر اپنی نیکیاں اس کے سینے میں بھرنے کی صلاحیت پیدا کریں۔ جب آپ دوسروں کے نقطہ نظر کو سمجھنے کی خواہش اپنے دل میں پیدا کر سکیں اور جب آپ کو یہ احساس ہو کہ جیسے میں خدا سے بخشش کا طالب ہوں اسی طرح مجھے دوسروں کی خطائیں معاف کر دینی چاہیں، جب ہم انسانوں کو شیطان اور فرشتہ سمجھنے کی عادت ترک کر دیں تو ہمیں کچھ انسان ملیں گے اور ہم کہہ اٹھیں گے۔

بہت دل خوش ہوا حالی سے مل کر
ابھی کچھ لوگ باقی ہیں جہاں میں

کامیاب زندگی کا نصاب بہت طویل بھی ہے اور بہت مختصر سی بھی، ضرورت اس امر کی ہے کہ ہم اس نصاب کا مطالعہ کریں اور زندگی کو ہر رنگ اور ہر ڈھنگ سے قبول کرنے کی صلاحیت پیدا کریں۔

جو مل سکے اسے لے لے اسے غنیمت جان
سفر سفر ہے یہاں گھر کی راحتیں مت ڈھونڈ

زندگی کے سفر کو جاری رکھیں' منزلوں کی تلاش ہمارا نصب العین ہو لیکن قناعت ہماری زندگی میں ایک مثبت قدر کی صورت میں جلوہ گر ہو اور جو کچھ مل جائے اسے بھی غنیمت سمجھیں اور جو نہ ملے اس کے لئے اس قدر بے قرار نہ ہو جائیں کہ ہماری رات کی نیند اور دن کا سکون غارت ہو کر رہ جائے۔

منزلوں کی بات چھوڑو کس نے پائیں منزلیں
اِک سفر اچھا لگا ، اک ہمسفر اچھا لگا

منزل مل جائے تو شکر کریں' نہ بھی ملے تو یہی کافی ہے کہ کوئی ہم سفر دو گام تو ساتھ چلا' اور اگر ایسا بھی ممکن نہ ہو تو تب بھی صبر کا دامن نہ چھوڑیں کہ زندگی زندہ دلی کا نام ہے۔ زندگی سعی پیہم سے عبارت ہے' سفر حیات میں کہیں کہیں ٹھوکریں بھی لگتی ہیں' گرنا بھی پڑتا ہے لیکن باہمت لوگ پھر اٹھ کھڑے ہوتے ہیں' ہمت نہیں ہار دیتے کیونکہ اکثر و بیشتر ناکامیاں' کامیابیوں کا پیش خیمہ ہوتی ہیں' ہماری زندگی میں جہاں ناکامیاں ہوتی ہیں وہاں کامیابیاں بھی ہمارا مقدر بنتی ہیں لیکن ہم کامیابیوں کو اکثر و بیشتر نظر انداز کر دیتے ہیں اور ناکامیوں کو وظیفہ حیات بنا لیتے ہیں۔ زندگی گزارنے کا بہترین اسلوب کیا ہے یہ کسی کو بھی معلوم نہیں اور مجھے بھی معلوم نہیں' لیکن میری رائے میں بہترین اسلوب وہ ہے جو اپنے حالات و واقعات کے پیش نظر تراشا جائے اور یہ صلاحیت' تعلیم ہم میں پیدا کرتی ہے۔ ہمیں اس قابل بنا دیتی ہے کہ ہم اپنے حالات و واقعات کے سیاق و سباق میں کچھ فیصلے کر لیتے ہیں اور فیصلے کرنے کی صلاحیت ہی دراصل تجربات' علم اور آگہی کا منہ بولتا ثبوت ہے۔

میں نے اپنے رب کو اپنے ارادوں کی شکست سے پہچانا

ہم جتنے بھی طاقتور' باذرائع' باوسیلہ اور بااختیار ہونے کے زعم میں مبتلا ہو جائیں ہم کبھی سچ مچ اللہ کے مقابلے میں طاقتور' باذرائع' باوسیلہ اور بااختیار نہیں ہو سکتے۔ ملٹن کے شیطان کو زعم تھا' اس نے اپنے منہ کی کھائی' اسے ثریا سے زمین پر تو کیا جہنم کے شعلوں میں جلتا ہوا' تڑپتا ہوا' سلگتا ہوا پھینک دیا گیا' کتنے فرعون' نمرود اور شداد آئے اور چلے گئے' وہ سدا سے ہے اور سدا رہے گا' اس کا کوئی ثانی نہیں' سجدہ اسی کو واجب ہے' عبادت اسی کی جائز ہے' ہر خواہش کا اظہار اسی کے سامنے زیب دیتا ہے' وہ سنتا ہے' دیکھتا ہے' ہاتھ تھام لیتا ہے' یہ ایمان انسان کو ہزار سجدوں سے نجات دے دیتا ہے، اسے توانا بنا دیتا ہے' اس میں بجلیاں بھر دیتا ہے' کیونکہ انسان یہ باور کر لیتا ہے کہ دنیا کی بڑی سے بڑی طاقت بھی اس کی راہ کا پتھر نہیں بن سکتی' مزاحم نہیں ہو سکتی' اسے روک نہیں سکتی' لیکن یہ کیا کہ ہم نے تو جانے کتنے دیوتا تراش رکھے ہیں' کتنے خدا گھڑے ہیں اور ان میں اس خدا کی صفات رکھ دی ہیں جس نے سب کچھ بنایا' جو سب کچھ مٹا سکتا ہے' تو پھر کیا ہر معاملے میں انسان مجبور محض ہے' کیا اسے کوئی ارادہ نہیں کرنا چاہیے ؟ اسے ہاتھ پہ ہاتھ رکھے بیٹھا رہنا چاہیے اور انتظار کرنا چاہیے کہ اس کے ہاتھ کو غیبی جنبش ملے گی تو وہ ہلیں گے ایسا ہرگز نہیں خدا سب سے زیادہ طاقتور ہے لیکن اس کا مطلب یہ نہیں کہ اس نے دنیا میں کٹھ پتلیاں تراشی ہیں اور ڈور خود تھام لی ہے۔ اس نے تو بااختیار' باارادہ' باحوصلہ انسان کو تخلیق کیا ہے اور اس کی مشیت یہی ہے کہ دنیا کا نظام کار انسان کے ہاتھ میں رہے تا کہ یوم حشر یہ فیصلہ ہو سکے کہ انسان نے ان صلاحیتوں کو کہاں تک استعمال کیا ہے جو اسے بحیثیت انسان' بطور امانت دی گئی تھیں۔ چنانچہ بسا اوقات ہم اپنی کاہلی' بدنیتی اور بے پرواہی کو مشیت ایزدی سے منسوب کر کے گھناؤنے جرم کے مرتکب ہوتے ہیں۔ یہ سچ ہے کہ وہ

چاہے تو شاخ پر ایک پتا بھی نہ پھوٹے لیکن اس نے پتے ہی کو نہیں بلکہ شاخ' درخت اور اس کی جڑ کو بھی طاقت اور قوت عطا کی ہے تاکہ وہ اپنی ہمت سے' اپنی صلابت سے بار آور ہو سکے۔

آپ کھیت میں بیج پھینکتے ہیں کچھ اگتے ہیں کچھ نہیں اگتے۔ خدا چاہے تو کوئی بیج بھی نہ اگے لیکن ایسا نہیں۔ وہ چاہتا ہے کہ کھیتیاں ہری بھری رہیں' جس بیج میں طاقت موجود ہوتی ہے اس کے سیلز توانا ہوتے ہیں اور اس کے مالیکیولز متحرک اور جسے اگنا نہیں ہوتا اس کے سیل اور مالیکیولز بے جان ہوتے ہیں۔ یہی حال انسانوں کا ہے جس میں جینے کی سکت ہوتی ہے وہ زندگی کی تگ و تاز میں ہمہ وقت محوخرام رہتا ہے اور جو زندگی سے عاری ہوتا ہے وہ بے حس پتھر کی طرح اپنی جگہ سے نہیں ہل سکتا۔ حقیقت یہ ہے کہ حضرت علیؓ نے یہ کہہ کر کہ ''میں نے اپنے رب کو اپنے ارادوں کی شکست سے پہچانا'' اپنی عبودیت کا اظہار کیا ہے اور اللہ کے معبود ہونے کا' وگرنہ انہیں معلوم تھا کہ اللہ نے انہیں اتنی صلاحیتیں دی ہیں کہ وہ خیبر کے قلعے کو مسخر کر سکتے ہیں اور بڑے سے بڑے کافر کو تہ تیغ۔ ان کی تلوار میں بہت طاقت ہے' اس کے سامنے کوئی ٹھہر نہیں سکتا' خدا طاقتور ہے' اس کی حکمرانی ہے لیکن اس کی حکمرانی ان حکمرانوں کی طرح نہیں جو اپنی رعایا کو جب چاہیں اپنے اشاروں پر نچانا شروع کر دیتے ہیں تاکہ ان کی عظمت کا ڈنکا بجتا رہے۔ اللہ تو بے نیاز ہے' اسے اپنی طاقت کے مظاہرے کی چنداں ضرورت نہیں ہوتی۔ چند مواقع پر اس کا غیظ و غضب ضرور ظاہر ہوتا ہے لیکن وہ تو رحیم و کریم ہے جو طاقتیں اس نے اپنے بندوں کو دی ہیں وہ انہیں بے وجہ ان سے واپس نہیں لیتا' وہ اپنی مخلوق کو پھلنے پھولنے دیتا ہے' اس نے اس عمل کی اجازت دے رکھی ہے تبھی تو وہ اس سے حساب لے سکے گا۔

پھر ایسا کیوں ہے کہ ہم نے اپنی تمام بے اعتدالیوں' بے پرواہیوں' معاشرتی برائیوں اور ناانصافیوں کو مشیّت ایزدی سے منسوب کر دیا ہے۔ ایک شخص اپنی غربت و عسرت کے باوجود اپنی بیٹی کے ہاتھ پیلے کرنا چاہتا ہے اور اسے شادی کے موقع پر کچھ تحفتاً دینا چاہتا ہے' اس نے پیسہ پیسہ اکٹھا کر کے کچھ اشیاء اکٹھی کر لی ہیں۔ کل بارات آنی ہے' تیاریاں مکمل ہیں سکھیاں

خوش ہورہی ہیں' ہونے والی دلہن کے دل میں جانے کیا کیا ارمان انگڑائیاں لے رہے ہیں کہ کوئی نانہجار نقب لگاتا ہے' سب کچھ لوٹ کر لے جاتا ہے' کچھ بھی باقی نہیں بچتا۔ آپ نے اسے تقدیر کا نام دے دیا' آپ پرسکون ہوکر بیٹھ رہے' اس نانہجار کی تلاش میں کوئی بھی نہ نکلا' جس نے خوشیوں کو غموں میں تبدیل کر دیا۔ ایک طالب علم دن رات پڑھائی میں محو رہتا ہے' یار لوگ عیش و عشرت میں محو ہیں مگر وہ مطالعہ میں محو ہر لمحہ ہر پل اپنی کتابوں سے فیض یاب ہونا چاہتا ہے۔ اساتذہ سے راہنمائی حاصل کرتا ہے' ماں باپ کی دعاؤں کا طالب ہوتا ہے۔ امتحان دیتا ہے بہت اچھے پرچے کرتا ہے مگر وہ پرچے تبدیل ہو جاتے ہیں وہ ناکام ہو جاتا ہے آپ اسے تقدیر کا نام دیں گے اور یہ کہہ کر مطمئن ہو جائیں گے کہ قدرت کو یہی منظور تھا؟ کتنے سفاک ہیں آپ ؟ کتنے ظالم؟ ظلم کو نہ روکنا سب سے بڑا ظلم ہے' آپ اس ظلم کو روکنے کی کوئی سبیل نہیں کرتے۔ بس یہ تصور کہ جس کے حکم کے بغیر پتا نہیں ہلتا اس کے حکم کے بغیر یہ طالب علم کیسے کامیاب ہوسکتا تھا۔ ایک لڑکی زندگی کی تمام تر کلفتوں اور الجھنوں کو برداشت کرتے ہوئے نئی زندگی کے خواب دیکھتی ہے' اسے زندگی کے عمل میں شریک ہونا ہوتا ہے وہ چاہتی ہے کوئی گھر آباد کرے اور اس کا رفیق سفر ایسا ہو جو اس کی روح کو پڑھ سکے' اس کی خواہشات کی تکمیل کر سکے' وہ مل جل کر خوش خوش زندگی گزار سکیں' وہ سوچتی ہے اس کا رفیق حیات اس کی خواہشوں کا مرکز ہوگا۔ وہ اس سے پیار کرے گی' وہ اس سے پیار کرے گا' وہ ایسا ہوگا' وہ ایسا ہوگا' لیکن فیصلہ یہ صادر ہوتا ہے کہ اسے اپنے فلاں کزن سے شادی کرنا ہوگی کیونکہ مرتے وقت اس کی خالہ کی خواہش یہی تھی۔ فلاں کزن اس کا رفیق حیات ہوگا کیونکہ جب وہ پیدا ہوئی تھی تو اس کی پھپھو نے یہ فیصلہ کر دیا تھا تمہیں اس سے شادی کرنا ہوگی اگر اس سے شادی نہ ہوئی تو ہماری جائیداد کا کیا بنے گا۔ دیکھو ہمارے سیاسی مقاصد ہیں انہیں ہر صورت پورا ہونا چاہیے' ہم نے تمہیں پالا پوسا ہے' تمہیں اس پر عمل کرنا ہی ہوگا'' ابا جان وہ تو پڑھا لکھا ہی نہیں'' ''ٹرٹر کرتی ہو' باتیں بناتی ہو' تم زیادہ سمجھتی ہو کہ ہم'' باپ گرج اٹھتا ہے۔ ماں کہتی ہے'' بیٹا اگر تم نے میری بات نہ مانی تو میں تمہیں دودھ

نہیں بخشوں گی'' بیٹا مجبور ہو جاتا ہے اور ایسی رفیقہ حیات اسے ملتی ہے جو زندگی کی ساتھی تو کیا اس کی تنہائیوں کی ساتھی بھی نہیں ہوتی اور ہم چپکے سے کہہ دیتے ہیں قسمت میں یہی لکھا تھا' تقدیر کا یہی فیصلہ تھا' خدا نے یہی چاہا تھا۔ خدا نے انسان کو اپنے فیصلوں میں آزاد چھوڑ دیا ہے۔ خدا کسی کے آنسوؤں سے خوش نہیں ہوتا' کسی کی آہیں اسے پسند نہیں' اس نے فیصلہ صادر کیا ہے کہ نکاح کے وقت بھری بزم میں لڑکا اور لڑکی اپنے دل کی گہرائیوں سے پوری آزادی کے ساتھ تین بار کہے کہ اسے فلاں بنت فلاں' فلاں ابن فلاں منظور ہے لیکن ہم نے منظوری لینے کے وہ انداز تراش لئے ہیں کہ جن کی کہانیاں رونگٹے کھڑے کر دیتی ہیں۔ ہم نے اپنے ذاتی مفادات کو اپنی اولاد کی خواہشات پر ترجیح دینے کا خوبصورت انداز تراش لیا ہے ہم اپنے ظلم کو، اپنی زیادتی کو رحیم وکریم خدا سے منسوب کر دیتے ہیں۔ مجھے ایک سسکتی ہوئی' روتی ہوئی دوشیزہ نے بتایا کہ وہ وہاں شادی کرنا نہیں چاہتی جہاں اس کے ماں باپ کر رہے ہیں اور اگر آج رسول اکرم ﷺ میرے سامنے موجود ہوتے تو میں سسک سسک کر اپنی داستان بیان کرتی اور مجھے یقین ہے کہ میری شنوائی ہوتی۔ مجھے جانے اس طرح کی کتنی سسکیاں سننے کا اتفاق ہوا اور آپ کو بھی ہوا ہو گا لیکن ہم نے یہ سب کچھ رحیم وکریم خدا کے کھاتے میں ڈال کر اپنی ذمہ داری سے کوتاہی کی۔ جس کے ہم سب مجرم رہیں گے۔ کاش کہ ہم خدا میں اور قبائلی نظام' عصبیتوں سے بھرے ہوئے معاشرے' ہندوانہ ذہنیت رکھنے والے اشخاص کے دیوتاؤں اور دیویوں میں فرق کر سکیں اور اللہ کی قدرت کا صحیح مفہوم سمجھ سکیں۔

ہے جرم ضعیفی کی سزا مرگ مفاجات

تمام ادیان، تہذیبیں، سب آسمانی کتابیں اور صحائف آدمی کو انسان بنانے میں منہمک رہے ہیں لیکن بہت سے واقعات اور حالات میں آدمی، انسان نہیں بن پایا، درندے، پرند اور چرند کمزوروں کا شکار کرتے ہیں اور اکثر و بیشتر اپنی روزی دوسروں کی زندگی سے کھیل کر تلاش کرتے ہیں مگر اس تلاش میں نہ پانچ سالہ منصوبے ہوتے ہیں نہ دس سالہ، نہ کمیٹیاں بیٹھتی ہیں، نہ اجلاس ہوتے ہیں، نہ خطرناک اسلحہ ایجاد کیا جاتا ہے اور نہ ہی نت نئی حکمت عملیاں تشکیل دی جاتی ہیں۔ شائد اس لئے کہ ان کے پاس شعور نہیں، سمجھ نہیں، لیکن ٹھہریئے! شعور اور سمجھ تو اللہ کی ایک بہت بڑی نعمت ہے، خیر کثیر ہے، وہی امانت ہے جسے قبول کرنے سے پہاڑوں نے انکار کر دیا تھا لیکن وقت کی ستم ظریفی دیکھیئے، حالات کی خوں آشامی ملاحظہ کیجئے کہ یہ سمجھ، یہ شعور، یہ خیر کثیر، یہ امانت سوہان روح بن گئی، ہم نے اس علم اور آگہی کو جسے زندگی کی بھلائی کے لئے استعمال ہونا چاہیے تھا اس کی تباہ کاریوں کے لئے استعمال کرنا شروع کر دیا۔ وجہ یہ ہوئی کہ مادیت، روحانیت پر غالب آ گئی اور جنگل کا قانون جو ہزاروں اور لاکھوں سال سے رائج تھا اسے اس کی انتہائی گھناؤنی صورت میں جاری رکھا گیا۔

ہماری تہذیب، ہمارے عقائد، ہمارے فلسفے، ہماری فکر و دانش کم و بیش سب کچھ جنگل کے قانون کی حفاظت کے لئے کام کرتے ہوئے دکھائی دیتے ہیں۔ اس میں شک نہیں کہ خدا نے پیغمبروں کا ایک طویل سلسلہ شروع کیا، اپنی مقدس کتابیں بھیجیں، تہذیبوں اور تمدنوں نے درس گاہیں اور دانش گاہیں تعمیر کیں، لیکن جانے کیا ہوا۔۔۔ وہی دیو استبداد اب بھی پائے کوباں دکھائی دیتا ہے، صرف اس کے خوبصورت نام رکھ دیئے گئے ہیں۔ کبھی اس دیو استبداد کو سرمایہ

داری کا نام دے دیا جاتا ہے تو کبھی اشتراکیت کا' کبھی جمہوریت کا اور کبھی کبھی مذہب کا' جو مذاہب محبتوں کے آئینہ دار تھے وہ نفرتوں کے سرچشمے بننے لگے' مذاہب میں فرقہ واریت نے جنم لیا۔ کیتھولک' پروٹیسٹنٹ کے خون کے پیاسے ٹھہرے تو کبھی پروٹیسٹنٹ کیتھولک کے' کبھی شیعہ سنی مخلوق پر ٹوٹ پڑے تو کبھی سنی' شیعہ مخلوق پر۔ کوئی براہمن بن گیا' کوئی شودر' کوئی کھشتری' کوئی ویش' کسی کے سامنے تمام نعمتیں ڈھیر کر دی گئیں' کوئی نان شبینہ کو ترستا رہا۔ مذہب' تہذیب' تمدن منہ تکتے رہے' یاس وحسرت میں ڈوبتے رہے' اگر کسی نے کلمۃ الحق بلند کیا تو اسے سولی پر چڑھا دیا گیا' تہ تیغ کر دیا گیا' گردن زدنی قرار دے دیا گیا' اسے باغی اور تخریب کار گردانا گیا۔ یہ صورت حال تو تھی ہی' جدید دور نے وحشت و بربریت کی نئی سے نئی صورتیں تراشنا شروع کر دیں' آزادی کے نام پر دہشت گردی جنم لینے لگی' مذہب کے نام پر سر قلم کئے جانے لگے، تہذیب کے نام پر عزتیں لٹنے لگیں' تمدن کے نام پر معصومیت کا خون ہونے لگا' چشم فلک یہ سب تماشا دیکھتی رہی' معصومیت کراہتی رہی' نیک نیتی چیخ و پکار کرتی رہی' آسمانی کتب اور صحائف طاق نسیاں بن گئے اور پھر دن دیہاڑے وہ سب کچھ ہونے لگا جس کا تصور ہلاکو' چنگیز' ہٹلر اور مسولینی بھی نہیں کر سکے تھے۔ سجدے میں محو سرتن سے جدا کئے جانے لگے۔ مسجدیں معبد اور عبادت گاہیں غیر محفوظ ہو کر رہ گئیں۔ کسی نے چندروز پہلے مجھ سے کہا ''تم کہتے ہو کہ پاکستان اسلام کا قلعہ ہے' اسلامی اقدار کا گہوارہ ہے مگر نماز پڑھتے وقت بندوق بردار تمہاری حفاظت کرتے ہیں''۔ میں کچھ شرما سا گیا اور بولا کہ اس میں قصور اسلام کے قلعے کا نہیں' اس میں قصور ان کا ہے جو قلعے کے محافظ ہیں' جو قلعے کے مقیم ہیں' حقیقت یہ ہے کہ اسلام کے اس قلعے میں' اسلام کے حق میں نعرے تو سنائی دیتے ہیں مگر اسلامی اصولوں کی پابندی صرف چند ایک کے حصے میں ہی آئی ہو گی۔ حقیقت یہ ہے کہ مذہب اسلام' سلامتی کا مذہب ہے' امن اور شائستگی کا درس دیتا ہے لیکن اس امن اور شائستگی کے مذہب کو ذاتی اغراض نے مسخ کر کے رکھ دیا ہے اور ایسا لگنے لگا ہے کہ جیسے اسلام کا سلامتی سے کوئی تعلق ہی نہیں۔ گاندھی جی نے اہنسا کی تعلیم دی' امن وسلامتی

کا پرچار کیا لیکن گاندھی کے ماننے والوں نے جنگ و جدل اور کشت و خون کو وظیفہ حیات بنا لیا' گوتم بدھ نے حشرات الارض کو کچلنے پر بھی ناپسندیدگی کا اظہار کیا مگر اس کے ماننے والوں نے بم بنائے جو حشرات الارض پر نہیں بلکہ خلق خدا پر چلیں گے۔ حضرت عیسیٰ کی تعلیمات کی تشریح مسیحیوں نے یوں کی کہ اگر کوئی تمہارے ایک گال پر طمانچہ لگائے تو دوسرا گال پیش کر دو' مگر عمل کی صورت' ناگاساکی اور ہیروشیما میں ملاحظہ کی جا سکتی ہے۔

الغرض مذاہب نے سب کو ایک بنایا' محبت کی تعلیم دی' بھائی چارے کا درس دیا' لیکن مذاہب کے خود ساختہ ٹھیکیداروں نے مذاہب کی وہ' وہ تشریحات کیں کہ الامان الحفیظ۔ دنیا جسے امن کا گہوارہ ہونا چاہیے تھا وہ نفرتوں کی آماجگاہ بن گئی۔ سینکڑوں اور ہزاروں معصوم جانوں کا خون بہا کر نخل مذہب کی آبیاری ہونے لگی۔ واشنگٹن اور نیویارک کا سانحہ انتہائی المناک ہے لیکن یہ کوئی پہلا واقعہ نہیں' یہاں تو روز ایسے واقعات سے اخبارات بھرے ہوتے ہیں' لیکن مسئلہ چونکہ ایک بڑی طاقت کی انا کا ہے اس لئے ساری دنیا کی نیندیں اچاٹ ہو گئیں' کاش کہ کراچی میں ہونے والی دہشت گردی' کشمیر میں ہونے والا ظلم' بوسنیا میں ہونے والی قتل و غارت' فلسطینیوں کے ساتھ ہونے والی ناانصافی بھی دنیا کی نیند اچاٹ کر سکتی۔

اس میں کلام نہیں کہ معصوم لوگوں کی جان سے کھیلنا گناہ کبیرہ ہے' کوئی مذہب' کوئی تہذیب' کوئی تمدن اس کی اجازت نہیں دے سکتا مگر یہ بات بھی ذہن میں رکھی جانی چاہیے کہ کوئی مذہب اور کوئی تہذیب اس امر کی بھی اجازت نہیں دیتے کہ طاقتور کمزور کی زندگیوں سے کھیلتا رہے۔ یہ کسی کو حق نہیں کہ ایک قوم کو بے گھر کر دیا جائے' کسی ملک کو زیر نگیں کر لیا جائے' کسی خطے پر ناانصافی کی حکمرانی رہے' دنیا کا ایک حصہ تو ہر نعمت سے مالا مال ہو اور ایک حصے کو بنیادی ضرورتیں بھی میسر نہ آئیں۔ غلط حکمت عملی' بے انصافی اور ظلم کو جنم دیتے ہیں' جب کسی قوم کو اس کے بنیادی حقوق سے محروم کیا جائے گا تو وہ قوم اخلاقی طور پر گراوٹ کا شکار ہو جائے گی' وہ اعلیٰ اصولوں کی پاسداری نہیں کر سکے گی۔ ضرورت اس امر کی ہے کہ اقوام عالم سچ مچ

دہشت گردی سے چھٹکارا پانا چاہتی ہیں تو انہیں مل جل کر حق کی قوتوں کا ساتھ دینا چاہیے اور عدل کے اصول قائم کرنے چاہئیں۔ جمہوریت کے نعرے لگانے والے سلامتی کونسل میں ویٹو کا حق رکھنے پر اب بھی مصر ہیں، اس سے بڑی حیرت اور تعجب کی بات اور کیا ہو سکتی ہے' اقوام متحدہ کو جمہوری ادارہ ہونا چاہیے' تمام اقوام کے مسائل کے حل کے لئے انٹرنیشنل کورٹ آف جسٹس کو فعال ہونا چاہیے' ظلم اور استبداد کا قلع قمع کرنے کے لئے ایک عالمی فوج کو معرض وجود میں لایا جانا چاہیے۔ خیر وشر کے تعین کے لئے کسی ایک ملک یا چند ملکوں کو مقرر نہیں کیا جانا چاہیے بلکہ اس کا فیصلہ جمہوری اصولوں پر کیا جانا چاہیے' دنیا میں ایک ایسا اقتصادی نظام عمل میں لایا جانا چاہیے کہ دنیا کے سب ممالک' سب قومیں اور سب معاشرے اپنی بنیادی ضرورتیں پوری کر سکیں اور جدید سہولتوں سے بہرہ ور ہو سکیں۔ اگر تمام نعمتیں ایک قوت یا چند قوتوں کی اجارہ داری بن گئیں تو دہشت گردی کی قوتیں پنپتی رہیں گی۔ ناانصافی کو دور کرنے کے لئے ناانصافی ہوتی رہے گی' ظلم کے خلاف ظلم صف آراء ہوتا رہے گا۔ یہ ایک ایسی حقیقت ہے جو قوت سے سرشار اقوام کی سمجھ میں آنا مشکل نظر آتی ہے۔ لیکن یہ سمجھ پیدا کرنی ہوگی۔ ہمیں امید ہے کہ بھیانک تجربات سے اقوام عالم کچھ سیکھیں گی، جنگ عظیم اول اور جنگ عظیم دوم تباہ کاریاں لائیں تو جنگ عظیم سوم بھی تباہ کاریاں لائے گی، ایسی تباہ کاریاں جو سارے کرہ ارض کو تہ و بالا کریں گی۔ اس سے پہلے کہ آسمانی قوتیں جوش میں آئیں، زمینی قوتوں کو ہوش کے ناخن لینے چاہئیں۔ قوت کسی کی غلام نہیں' یہ ایک ایسی محبوبہ ہے جو نت نئے معاشقے تراشتی رہتی ہے' اصل چیز محبت ہے' اخوت بھائی چارہ' امن اور یہ سب کچھ اس وقت تک ممکن نہیں جب تک ہم جیسی اقوام اپنے پاؤں پر کھڑا ہونا نہ سیکھیں۔

پاکستان ایک نظریاتی مملکت ہے اور نظریہ یہ ہے کہ ہمیں ایک ایسی ریاست قائم کرنی ہے جو مثالی ہو۔ مثالی ریاست کے لئے ہمیں مثالی اخلاق کا ثبوت دینا ہوگا' مثالی بھائی چارے کو فروغ دینا ہوگا' ہمیں جدید دور کے تقاضوں سے ہم آہنگ ہونا ہوگا۔ سائنس

اور ٹیکنالوجی سے بہرہ ور ہونا ہوگا' ہمیں عقائد' علاقوں اور عصبیتوں کو خیر باد کہہ کر ایک ہی عقیدے، ایک ہی ملک اور ایک ہی اسلوب حیات پر عمل پیرا ہونا ہوگا اسی میں ہم سب کی خیر ہے وگرنہ

؎ ہماری داستاں تک بھی نہ ہوگی داستانوں میں

کیونکہ اصول فطرت بقول اقبالؒ یہی ہے۔

علموں بس کریں او یار

علم کی تعریف میں کیا کچھ نہیں لکھا گیا اس کی عظمت' پاکیزگی اور روشنی سے کیسے انکار ہو سکتا ہے' خود نبی پاک ﷺ پر پہلی وحی علم سے متعلق تھی۔ انہیں پڑھنے کا حکم دیا گیا تھا' علم جاننا ہے اور اسی جاننے کی خوبی نے فرشتوں کو آدم کے سامنے سجدہ ریز ہونے پر مجبور کر دیا۔ زندگی علم کے سوا کچھ بھی نہیں' کسی شے کا علم نہ ہو تو شے ہی نہیں رہتی۔ یہ علم ہی ہے جس نے انسان کو پوری کائنات پر قدرت عطا کر دی ہے۔ اس نے پہاڑوں کو مسخر کر لیا ہے' سمندر کے سینے چاک کر دیئے ہیں۔ صحراؤں کے اسرار سے واقف کرا دیا ہے۔ علم کی کہاں تک عظمت بیان کیجئے گا۔ یہ اظہر من الشمس ہے مگر محض علم کبھی کبھی بے معنی اور بے مصرف ہو جاتا ہے۔ محض چیزوں کو جان لینا یا ان کا ادراک کر لینا' کھوج لگا لینا اچھا لگتا ہے لیکن اگر اس علم کو انسانی فوز و فلاح کے لئے استعمال نہ کیا جائے تو اس کا حصول بے معنی ٹھہرتا ہے اور اگر علم تخریب کاری' تباہی اور بربادی کے لئے استعمال ہو تو پھر علم سب سے بڑا جرم ہو جاتا ہے' وہ جرم جو شیطان سے سرزد ہوا' شیطان جو کہ علم کے اعتبار سے سب سے آگے تھا ٹھوکر کھا گیا کیونکہ اس کے علم نے تخریب کی راہ اختیار کر لی' اسے متکبر بنا دیا' وہ خودسر ہو گیا۔ اس طرح کا علم انسانیت کو بڑا مہنگا پڑا ہے۔ ایٹم علم کی دین ہے لیکن ایٹم کتنی بڑی قیامت ہے کتنی بڑی تباہی ہے اس کا اندازہ ہیروشیما اور ناگاساکی کے المیہ سے ہو سکتا ہے۔ ہنستے' بستے شہر قبرستان بن گئے' علم نے جو گل کھلائے اس کا اندازہ آپ کو گیارہ ستمبر کے حادثات سے بھی ہو سکتا ہے۔ نیویارک اور واشنگٹن کے جیتے جاگتے انسانوں نے قیامت صغریٰ کا منظر دیکھ لیا اور اسی علم کی بجلیاں بھوکے ننگے افغانوں پر گریں' اسی علم کی قیامتیں کبھی فلسطین پر ٹوٹیں تو کبھی عراق پر' جنگ عظیم اول اور دوئم اس علم کی جیتی جاگتی تصویریں

ہیں، یہی علم ہے جس نے ایسے ہتھیار ایجاد کر لئے ہیں جو ہنستی بستی دنیا کو نیست و نابود کر سکتے ہیں، اس علم نے ایسی طاغوتی قوتوں کی شکل اختیار کر لی ہے جن کے باعث رات کا چین ممکن ہے نہ دن کا آرام، کوئی مسجد میں محفوظ ہے نہ گھر میں، نہ بازار میں، دراصل یہ علم انسان کی کج فکری کا نتیجہ ہے اور اسی علم سے پناہ مانگی گئی ہے، اگر علم میں اعلیٰ انسانی اقدار موجود نہیں، اگر جاننے کی خواہش، خیر اور حسن کو جاننے کی خواہش نہیں تو ایسا علم سرے سے علم ہی نہیں، علم سے مراد جاننا ہے لیکن کیا جاننا؟ یہ جاننا کہ زندگی کس طرح خوشیوں، کامیابیوں اور بھلائیوں کا سرچشمہ بن سکتی ہے اگر علم اس خواہش سے عاری ہے تو ایسا علم کسی طرح بھی رحمانی علم نہیں کہلوا سکتا، اقبال نے ایک جگہ کہا تھا۔

علم را بر طن زنی مارے بود
علم را بر جاں زنی یارے بود

یعنی علم کو صرف مادیت کے حصول کا ذریعہ نہیں ہونا چاہیے بلکہ اسے روحانی اقدار کے احیاء کے لئے استعمال ہونا چاہیے، یہ بھی سچ ہے اور بہت بڑا سچ کہ بے علمی ایک نعمت ہے اور علم ایک جہنم۔ پوپ نے اپنی نظم Essay On Man میں ایک جگہ کہا تھا کہ اللہ نے موت کا علم اپنے پاس رکھ کر کتنا اچھا کیا ہے وگرنہ یہ کیسے ممکن تھا کہ کوئی جانور جس پر چھری چلنے والی ہو اچھلتا کودتا رہتا اور کوئی انسان جس کے پاس موت کا فرشتہ کھڑا ہو زندگی کے کاروبار میں محو رہتا۔ موت کا علم نہ ہونا عمل کو جنم دیتا ہے۔ کچھ چیزوں کا معلوم نہ ہونا ان کے معلوم ہونے سے کہیں بہتر ہوتا ہے۔ یہ سچ ہے کہ جاننا بہت ضروری ہے مگر یہ بھی سچ ہے کہ جاننے کی قیامت بھی بڑی لرزہ خیز ہے، ایک انسان ہنس کھیل رہا ہے وقت آنے پر یہ مر جائے گا لیکن کوئی یہ کہہ دے کہ اسے کینسر ہے وہ ہائی بلڈ پریشر کا شکار ہے تو دیکھیئے اس پر کیا قیامت بیتتی ہے۔ قیامت کا تصور بسا اوقات قیامت سے زیادہ لرزہ خیز ہوتا ہے۔ یہ سب کو معلوم ہے کہ انہیں مرنا ہے لیکن

اگر یہ معلوم ہو جائے کہ انہیں کب مرنا ہے تو ہر روز مرنے لگیں۔اس میں شک نہیں کہ زندگی کی تمام ہما ہمی تمام ارتقاء' تمام کامیابیاں علم کی رہین منت ہیں لیکن علم نے انسان سے اس کی معصومیت بھی چھین لی ہے پراسراریت بھی، جو زندگی کی ایک بڑی نعمت تھی۔وہ دن بھی تھے جب انسان چیزوں کو اپنی مرضی کے مطابق دیکھتا تھا' چراغ اس وقت گل ہوتا تھا جب کسی کی روح قفس عنصری سے پرواز کر رہی ہو، سرخ آندھی اس وقت چلتی تھی جب کوئی قتل ہو رہا ہوتا تھا' زلزلہ اس وقت محسوس ہوتا تھا جب زمین گناہوں کی آماجگاہ بن جاتی تھی۔یہ سب کچھ غلط سہی لیکن اس کا کیا کیجیئے کہ علم نے انسان سے اس کی اعلیٰ اقدار چھین لی ہیں اب لاکھوں مریں تو کوئی سرخ آندھی نہیں چلتی' کوئی زلزلہ نہیں آتا کچھ بھی تو نہیں ہوتا۔اب انسان جان گیا ہے۔بے شک اسے اپنی موت کا وقت اب بھی معلوم نہیں لیکن علم نے اسے ہر لحہ مرنے کی عادت ڈال دی ہے'اب وہ مرتا ہے پر مرتا بھی نہیں' جیتا ہے مگر جیتا بھی نہیں' زندگی اور موت کی یہ آنکھ مچولی اس کے ذہن اور دل پر ہر وقت جاری رہتی ہے' علم نے اسے برہنہ کر دیا ہے،اس کے عقائد اس سے چھین لئے ہیں وہ ہر چیز کی وجہ تلاش کرتا ہے ہر چیز کا سبب بتاتا ہے' یہ سب کچھ مادی ترقی کا باعث تو بنا ہے لیکن اس نے انسانی نفسیات کو مرض الموت سے دوچار کر دیا ہے، اس علم کا کیا کیجیئے گا کہ جس نے انسان کو خوابوں کی صلاحیت سے بھی محروم کر دیا۔

نہ سہی حقیقتوں پر مرا خواب پر تو حق ہے
میں کچھ اور دیر سو لوں مجھے دیر سے جگانا

مگر ظالم علم نے' قاتل آگہی نے اس سے خواب کی صلاحیت بھی چھین لی ہے' اب اسے نیند نہیں آتی۔خواب تو در کنار' علم نے اسے بتا دیا ہے کہ وہ تو کچھ بھی نہیں' محض ایک میکانکی صورت حال کا نتیجہ ہے۔ایسے میں ایمان کی بنیادیں ہلنا شروع ہو جاتی ہیں۔ضرورت اس امر کی ہے کہ علم کو مومن بنایا جائے' علم سے بھلائی کا کام لیا جائے اور یہ تصور کر لیا جائے کہ ابھی

زندگی کو بہت کچھ سیکھنا ہے اور ایسا علم بھی ممکن ہو سکتا ہے جو اس علم کو باطل ثابت کر دے' کیا ضروری ہے کہ ہم یہ مان لیں کہ موجودہ سائنسی حقیقت ہی آخری حقیقت ہے۔ ابھی تو زندگی کو آگے بڑھنا ہے، جانے کتنی بجلیاں اور کتنے طور نمودار ہوں گے۔

ع یہ کائنات ابھی ناتمام ہے شائد
کہ آرہی ہے دمادم صدائے کُن فیکون

جب ابھی کُن فیکون کا عمل جاری ہے تو پھر کوئی علم بھی حتمی نہیں' کوئی علم بھی آخری نہیں' اول و آخر علم تو وہی ہے جو ہمیں اس نے دیا جو تمام علوم کا منبع ہے' ہمارا خدا' خلاقِ اعظم کہ جس کے پاس علوم کے خزانوں کی تمام چابیاں ہیں' ہم تمام علم کے باوجود بھی جاہل ہیں' جاہل مطلق۔

شہرت

کہتے ہیں کہ جب کوئی پیدا ہوتا ہے تو اسی دن سے اس کی موت کا اہتمام ہونے لگتا ہے اور یہ اہتمام کرنے کے لئے جانے زندگی کتنے داؤ پیچ کھیلتی ہے۔ ایک انسان ہمہ وقت زندگی سے نبرد آزما رہتا ہے' وہ جینا چاہتا ہے اور زندگی موت کی طرف مائل نظر آتی ہے۔ فطرت جانے کس کس رنگ میں موت کا روپ دھارتی ہے۔ Wordsworth نے تو فطرت کو سکون و آشتی کی دیوی کہا لیکن اس کے ناقدین نے ثابت کیا کہ Wordsworth فطرت کے صرف ایک پہلو اور ایک ادا ہی کا اسیر ہو گیا تھا۔ اس نے فطرت کی خونی ادائیں یا تو دیکھی نہ تھیں یا انہیں دانستہ طور پر نظر انداز کر دیا تھا۔ افریقہ کے لق ودق صحراؤں میں فطرت کی خون آشام ادائیں زندگی پر لرزہ طاری کر دیتی ہیں' بنگال کے سیلاب فطرت کا ہی ایک بھیانک روپ ہیں۔ کبھی فطرت قطرے قطرے کو ترساتی ہے اور کبھی انسان کو ڈبو کر رکھ دیتی ہے۔ فطرت کو کبھی رحم نہیں آتا کہ کوئی بے سہارا' یخ کر دینے والی ہواؤں کی زد میں ہے اور کوئی جھلسا دینے والی دھوپ سے دوچار ہے۔ بحر کیف فطرت کا تو رونا ہی کیا' انسان خود انسان کا بدترین دشمن ہے اور انسان نے انسان کی ہلاکت کے لئے جو ساز و سامان تیار کیا ہے وہ کسی اور مخلوق کے یہاں دستیاب نہیں ہو سکتا۔ بے شک بھیڑیا اور شیر اپنے سے کمزوروں کا شکار کر لیتے ہیں مگر وہ یہ سب کچھ اپنے بل بوتے پر کرتے ہیں وہ ان تباہ کن ہلاکت خیز ہتھیاروں کے بارے میں سوچ بھی نہیں سکتے جن سے انسان کے اسلحہ خانے لبریز ہیں۔

فطرت ہی نہیں خود انسان بھی اپنا دشمن ہے۔ انسان کے دشمنوں کی فہرست بڑی طویل ہے' کچھ دشمن ایسے ہیں جن کی شناخت ممکن ہے لیکن ایسے بھی ہیں جن کی شناخت کار محال ہے'

جن میں سے ایک خون آشام دشمن ''شہرت'' ہے' شہرت کا جنون ہے' شہرت کی انمٹ خواہش ہے ایسی خواہش جو اندر ہی اندر انسان کو گھن کی طرح چاٹتی رہتی ہے اور انسان داعی اجل کو لبیک کہہ دیتا ہے۔

Freud کے نزدیک انسان کی بنیادی کمزوری جنس ہے مگر Adler اور Jung نے شہرت کو انسان کی بنیادی کمزوری کہا ہے۔ ان کے خیال میں ہر انسان اپنا اثبات چاہتا ہے۔ ایک مقام چاہتا اور اگر یہ مقام اور اثبات فطری طریقے سے ممکن ہو جائے تو زندگی سہل گزرتی ہے اور اگر ایسا ممکن نہ ہو تو زندگی جان کا روگ بن جاتی ہے' کینسر کا روپ دھار لیتی ہے جس کا کوئی علاج ممکن نہیں ہوتا۔ تاہم نام و نمود اور شہرت کی خواہش انسان کی بنیادی جبلت ہے۔ بچہ اس وقت تک توڑ پھوڑ میں لگا رہتا ہے جب تک اسے احساس نہ ہو جائے کہ وہاں اس کا نوٹس لینے والے موجود ہیں۔ بچہ توجہ چاہتا ہے' محبت چاہتا ہے' اپنی انفرادیت کا اظہار کرنا چاہتا ہے اور اس کے لئے وہ دانستہ و نادانستہ بہت سے حیلے بہانوں سے کام لیتا ہے۔ جب بچہ بڑا ہو جاتا ہے تو شہرت اور ناموری کی خواہش کا پودا ایک درخت کی صورت اختیار کر لیتا ہے۔ Wordsworth نے اپنی ایک نظم میں اس اندوہناک کیفیت کا خوب ذکر کیا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ ایک چھوٹا سا بچہ دھیرے دھیرے زمین کی گود میں راحت محسوس کرنے لگتا ہے' بہت سے کھلونے اس کا دل بہلانے لگتے ہیں' ساری عمر ان کھلونوں کے ساتھ کھیلنے میں گزر جاتی ہے' اس طرح وہ اپنی روحانی دنیا کو نظرانداز کر دیتا ہے اور مادی محبوبہ سے ہم آغوش ہونے کے لئے اپنا سب کچھ تج دیتا ہے۔ شہرت کی خواہش کبھی انسان کو دولت کا پجاری بنا دیتی ہے تو کبھی وہ حرص و آز کا شکار ہو جاتا ہے' کبھی اس پر سکندر' چنگیز اور تیمور کی طرح دنیا کو فتح کرنے کا بھوت سوار ہو جاتا ہے تو کبھی وہ کسی فن کی دیوی کے چرنوں میں اپنی زندگی ڈھیر کر دیتا ہے۔ بس یونہی شہرت کی خواہش اسے گمنامی کی وادیوں میں گھسیٹ کر لے جاتی ہے اور کبھی Browning کی طرح وہ اپنے دل کو کسی نہ کسی طریقے سے تسلی دینے پر مجبور ہو جاتا ہے۔ Browning کی نظم Last ride Together کا ہیرو مطمئن ہے۔ اپنی محبوبہ کے دو

ٹوک انکار کے باوجود بھی وہ عمر بھر اس حسن کی دیوی کے گیت گاتا رہا' اس کی راہ میں آنکھیں بچھاتا رہا لیکن جب اس نے عرض مدعا کیا تو محبوبہ نے انکار کر دیا پر وہ گھبرایا نہیں اس نے اپنے دل کو تسلی دی اور سوچا کہ کچھ کم اہم چیز مانگ لیتے ہیں اور اپنی محبوبہ سے درخواست گزار ہوا کہ ''گھوڑے پر آخری سواری ہی میرے ہمراہ کر لو'' محبوبہ مان گئی اور ہیرو کی خوشی کی انتہا نہ رہی۔ اس نے کہا کون ہے جسے یہاں سب کچھ مل گیا ہے۔ ایک سنگ تراش زندگی بھر سنگ تراشتا رہتا ہے، ایک آدھ ہی، بت بنا سکتا ہے۔ ایک شاعر شعر کہتا رہتا ہے' کتنے شعر ہیں جو اس کے بعد زندہ رہتے ہیں۔ بس سب کچھ نہیں ملتا، جو کچھ ملے اسے لے لینا چاہیے لیکن شہرت کا اسیر' ایسا نہیں سوچتا وہ ہمہ وقت شہرت کے پیچھے دوڑتا رہتا ہے۔ شہرت کی محبوبہ ظالم و سنگدل تو ہوتی ہی ہے' جانے کتنوں کو نیم بسمل اور بے جان کر کے دھتکارتی ہے لیکن پھر بھی شہرت کے غلام اسی دیوی' اسی محبوبہ کے کوچوں کی خاک چھانتے رہتے ہیں' انہیں کچھ بھی تو نہیں ملتا۔ اتفاقاً شہرت کی دیوی کو رحم آ جائے تو اور بات ہے کسی کے سر پر ہما بیٹھ جائے تو یہ الگ بات ہے' کوئی Oedipus کسی آسیب کے سوالوں کا جواب دے کر تخت نشین ہو جائے لیکن ایسا کبھی کبھی ہوتا ہے مگر شہرت کے متوالے' نام و نمود کے پرستار' عظمتوں کے رسیا' ہمہ وقت سرابوں کے پیچھے دوڑتے رہتے ہیں اور اپنی زندگی سے ہاتھ دھو بیٹھتے ہیں۔

دراصل شہرت کی خواہش ایک سم قاتل ہے' لیکن کچھ اچھا کام کرنے کی خواہش' نیکی کرنے اور دریا میں پھینک دینے کا جذبہ انسان کو سکون عطا کرتا ہے' اطمینان دیتا ہے' کچھ کرنے کی خواہش اور تیز ہو جاتی ہے' کسی نیکی کا صلہ لینے کی خواہش' نیکی کی روح کو داغدار بنا دیتی ہے۔ دراصل زندگی کچھ کرنے اور کچھ کر گزرنے سے عبارت ہے مگر یہ سب کچھ کسی صلے یا انعام کے لئے نہیں ہونا چاہیے بلکہ اچھا کام خود اپنا انعام ہے اگر آپ کے دل کو یہ یقین ہو کہ آپ جو کچھ کر رہے ہیں وہ خیر کے لئے ہے تو یہ ایک بہت بڑا یقین ہے' ایسا یقین جو آپ کو لافانی بنا دیتا ہے۔ عظیم بنا دیتا ہے اگر آپ اپنے ضمیر کے سامنے سرخرو ہیں تو آپ کامیاب و کامران ہیں' جو ہم سے پہلے آئے انہوں نے

ہمیں بہت کچھ دیا' یہ جو کچھ ہمارے پاس ہے ہماری کائنات ہے' یہ ہمارے بزرگوں' ہمارے اسلاف کی کاوشوں کا نتیجہ ہے۔ ان میں سے بہت سوں کے نام تک کوئی نہیں جانتا۔ OliverGoldsmith نے اپنی نظم Deserted Village میں لکھا ہے کہ جانے کتنے ملٹن کتنے Cromwell گاؤں میں مدفون ہیں انہیں کوئی نہیں جانتا' حقیقت یہ ہے کہ انہیں بے شک کوئی نہ جانتا ہو لیکن ان کی خدماتِ جبین حیات پر رقم ہوتی ہیں۔ کھیتوں میں کام کرنے والا کسان زندگی کو بہت کچھ دے رہا ہوتا ہے۔ بے شک مسند شہرت اسے کبھی حاصل نہیں ہوتی۔ اس طرح شہروں شہروں اور گاؤں گاؤں میں جانے کتنے لوگ عروسِ حیات کی مشاطگی کرتے ہیں یہ مشاطگی جاری رہنی چاہیے' کسی صلے کی تمنا کے بغیر' کسی خواہش کے انعام کے بغیر۔ اگر ایسا ہے تو پھر ہمارے دن اور ہماری راتیں ہمارے لئے بامعنی ہو جائیں گی' ہمیں دلی خوشی اور روحانی اطمینان حاصل ہوگا اور اس طرح ہم اپنے ہونے کا قرض اتار رہے ہوں گے اور زندگی کو خوبصورت تر بنا رہے ہوں گے۔

ہمت کے چراغ

ہمت کے چراغ کب فروزاں ہوتے ہیں؟ کب تیرہ سے رات بقعۂ نور بنتی ہے؟ کب وجود کی نس نس سے آنکھ جھانکتی ہے؟ روشنیوں کے شہر کب آباد ہوتے ہیں؟ اس سوال کا جواب بہت مشکل ہے اور اس کے کئی نفسیاتی' اخلاقی اور سماجی پہلو ہیں۔ کون ہے جو ہمت والا کہلانا نہیں چاہتا' کون ہے جو ہمت کے پر لگا کر اڑنا نہیں چاہتا' وہ کون ہوتے ہیں جن کی ہمت جواب دے جاتی ہے' جن کا دل ٹوٹ جاتا ہے' جن کی منزلیں سراب بن جاتی ہیں' یہ سوال خاصا فکر انگیز ہے جب یہ خبر پڑھنے کو ملتی ہے یا کہیں سے موصول ہوتی ہے کہ فلاں نے خودکشی کر لی تو ہر طرف اندھیرا سا چھا جاتا ہے اور المیہ اپنے پورے گھناؤنے پن کے ساتھ دل و نگاہ پر الم رقم کرتا ہے' کب کوئی اپنی جان سے ہاتھ دھونے پر مجبور ہوتا ہے' شائد اس وقت جب آس کی قندیل بجھ جاتی ہے' جب امید کے دیے گل ہو جاتے ہیں' سہارے' سائے نظر آنے لگتے ہیں' اپنے پرائے بن جاتے ہیں' وہ جو جان دیتے تھے جان لینے پر آمادہ نظر آتے ہیں' دور دور تک امید کی کوئی کرن نظر نہیں آتی' لیکن ایسے میں ہمت والا دل اپنے اندر روشنی کی شمع روشن کرتا ہے' اجالے تراشتا ہے کہ قوت کا سرچشمہ کہیں باہر سے نہیں پھوٹتا' اندر سے پھوٹتا ہے' جب اندر' جب باطن' جب دروں مضبوط ہو جاتا ہے تو پھر انسان ہمت کا پہاڑ بن جاتا ہے' ایک ایسا ایٹم بن جاتا ہے جو ٹوٹے تو دور دور تک سب کو درہم برہم کر دیتا ہے اور اگر نہ ٹوٹے تو اس کی قوت سے زندگی جگمگ جگمگ کرنے لگتی ہے۔

یہ محض خطابت نہیں' یہ جگ بیتی نہیں' کوئی سنی سنائی حکایت نہیں بلکہ قصہ ہے میری اپنی ذات کا بھی' جب آٹھ سال کی عمر میں بینائی مجھ سے چھن گئی تو جانے کیوں ہر طرف اندھیرا ہی اندھیرا نظر آنے لگا۔ گھٹا ٹوپ اندھیرا' محبتوں کے فقدان کا اندھیرا' دوستوں کی دوری کا اندھیرا' ماں باپ کی یاسیت کا اندھیرا اور مستقبل کا اندھیرا' اندھیرا ہی اندھیرا' اس اندھیرے میں جانے

کیوں مجھے زیادہ نظر آنے لگا' اس سے کہیں زیادہ جو آٹھ سال کی عمر میں نظر آتا ہے۔ شائد کہیں اندر کسی ہمت نے انگڑائی لی اور یہ ہمت وہ تھی جو تجربے نے مجھے دی۔ تجربہ جو مجھے کچھ دوسرے بینائی سے محروم احباب کو مل کر ہوا۔ ہمارے محلے کی مسجد کا امام تو پریشان نہیں ہے' میں نے سوچا مجھے بھی پریشان نہیں ہونا چاہیے۔ یہ محض ایک کرن تھی۔ پھر جب میں نابیناؤں کے سکول واقع شیرانوالہ گیٹ لاہور میں داخل ہوا تو ہر طرف اجالا ہی اجالا تھا۔ سب کتنے خوش باش تھے' کتنے ہمت والے تھے جو مجھے بھی ہمت والا بنا گئے اور پھر زندگی کے سفر کا آغاز ہوا' اس سفر میں جانے کتنے نام آئے جب ہمت کی آزمائش ہوئی' غموں کی یورش ہوئی اور چیلنجز آئے لیکن میرے اندر کوئی یہ کہہ دیتا تھا' ہارنے کی ضرورت نہیں خاطر جمع رکھو' جانے کتنے ہیں جنہیں تم سے کہیں زیادہ آزمائشوں سے دوچار ہونا پڑتا ہے' تمہاری آزمائش تو کوئی اتنی بڑی آزمائش نہیں' پھر وہ وقت بھی آیا جب میں نے انگریزی ادب کا مطالعہ شروع کر دیا اور ہمتوں کے جانے کتنے پہاڑوں کی سیر ہوگئی' حوصلے کے کتنے چراغوں کی روشنی نے میری زندگی کو نئے رخ عطا کئے' شکسپیئر کے ایک کردار کے الفاظ نے تو مجھے زندگی ہی دے دی۔

we are not the first

Who with best meaning have incurred the worst

ہم پہلے نہیں جو بہترین ارادوں کے باوجود بدترین صورت حال سے دوچار ہوتے رہے ہیں۔ اقبال نے تو میری تعمیر کرنا شروع کر دی' غالب کو پڑھا تو زندگی کچھ اور سہل نظر آنے لگی۔

تاب لائے ہی بنے گی غالب
واقعہ سخت ہے اور جان عزیز

حوصلے اور ہمت کے بغیر زندگی میں رہ ہی کیا جاتا ہے' اگر دکھوں کا شمار کرنے لگیں تو اعداد ختم ہو جائیں اور سکھوں کا شمار کرنے کا ہمارے پاس وقت ہی نہیں ہوتا' اس لئے دکھ ہمیں زیادہ دکھی بنا دیتے ہیں اور دکھوں کی اس سازش میں ہم خود بھی شریک ہوتے ہیں۔ انگریزی کے سولہویں صدی کے ایک شاعر جون ڈن نے کس خوبصورتی سے اس صورت حال کو بیان کیا ہے۔

O' how feeble is man`s power
that if good fortune fall
Can not add another hour
Nor the lost hour recall!
but come bad chance
And we join to it our Strength
And we teach it art and length
Itself over us to advance."

''انسان کی طاقت کتنی کم ہے کہ اگر کوئی اچھا لمحہ آئے تو اس میں وہ کوئی اضافہ نہیں کر سکتا اور نہ کوئی گیا لمحہ واپس بلا سکتا ہے اور اگر کوئی برا لمحہ آ جائے تو ہم اپنی تمام قوتیں اس میں شامل کر دیتے ہیں اور اسے مزید ہوا دیتے ہیں کہ یہ ہم پر غالب آ جائے'' الم کو زیادہ الم آگیں بنانے کا ہنر تو ہمیں خوب آتا ہے لیکن الم کو خوشی میں تبدیل کرنے کا ہنر بہت کم لوگوں کے ہاتھ لگا ہے اور جن کے ہاتھ لگا وہ عظمت کے مینار بن گئے' ہمتوں کے چراغ ٹھہرے اور پھر زندگی کی تمام کامیابیاں تمام خوشیاں ان کے سامنے ڈھیر ہو گئیں۔

یہ ہنر ہے کیا' یہ کوئی طلسم ہے یا جادو' کوئی منتر ہے یا کوئی اور مافوق الفطری عمل' حقیقت یہ ہے کہ یہ جادو ہر شخصیت کا جزو لاینفک ہے' خلاق اعظم نے ہر فرد کو اس قوت سے نوازا ہے لیکن اس

کی دریافت کا کام اس کی اپنی صوابدید پر چھوڑ دیا ہے اور یہی اس کی خوشی ہے اور یہی اس کی آزمائش ہے۔ یہی چیز اسے اشرف المخلوقات بناتی ہے کہ وہ کیسے اپنے لئے راہیں تراشتا ہے کیسے منزلیں اجالتا ہے کس طرح ماہ وانجم روشن کرتا ہے اور کس طرح دکھ کو سکھ میں تبدیل کر دیتا ہے، انہونی کو ہونی بنا دیتا ہے۔ ہیلن کیلر انیس ماہ کی عمر میں بینائی اور سماعت سے محروم ہو جاتی ہے اور نتیجتاً قوت گویائی بھی نمو پذیر نہیں ہوتی لیکن وہ ہمت نہیں ہارتی۔ اپنی شخصیت کی سلابت سے امریکہ کی مشہور ترین خاتون بنتی ہے۔ بابر فرغانہ سے نکلتا ہے اور مغلیہ سلطنت کی داغ بیل ڈالتا ہے، ابراہم لنکن عسرت سے اور غربت سے زندگی کا آغاز کرتا ہے امریکہ کا صدر بن جاتا ہے۔ ایسے ستاروں' ایسے اجالوں' ایسی روشنیوں ہی سے زندگی کی روشنی باقی ہے، تو پھر ایسا کیوں ہے کہ ہم اپنے اردگرد ہر ایک کو مایوس' بے حوصلہ اور بے سہارا پاتے ہیں' ہر ایک کہہ رہا ہوتا ہے ''یار میرے بس میں کیا ہے'' زندگی عذاب ہے' سب کچھ قسمت کرتی ہے' سب اوپر والا کرتا ہے' آوے کا آوا ہی بگڑا ہے' ہم کیا کر سکتے ہیں' اتنا پڑھتا ہوں پھر بھی فیل ہو جاتا ہوں ''قسمت کے خلاف کون لڑ سکتا ہے'' کیا کہنے! ہم بھی کیا خوب ہیں پاپ خود کرتے ہیں اور نام شیطان کا بدنام کرتے ہیں' سستی کا مظاہرہ خود کرتے ہیں اور نتائج کا ذمہ دار کسی اور کو ٹھہراتے ہیں، کیونکہ صرف اسی طرح ہم اپنی کمزوریوں کا جواز پیش کر سکتے ہیں' لیکن یہ بات یاد رکھنی چاہیے کہ اللہ نے سب کچھ انسان کے لئے مسخر کر دیا ہے اور اسے بے پناہ ہمت اور حوصلے سے نوازا ہے' ضرورت اس امر کی ہے کہ ہم مایوسی کے عالم میں بالکل بے ہوش نہ ہو جائیں اور عقل کے ہتھیار کو ناکارہ نہ سمجھنے لگیں۔ Emily Brontae کی نظم کا ایک کردار مایوس ہے' خودکشی پر تیار ہے' شاعرہ کہتی ہے گھبرا گئے' یہ بات بھول گئے کہ تم نے کتنا سفر طے کر لیا ہے اگر تم اتنا سفر طے کر سکتے ہو تو باقی ماندہ سفر سے کیوں گھبراتے ہو' ملٹن کی ''جنت گم گشتہ'' کا شیطان اگر شیطان نہ ہوتا تو اس کے لفظوں کو رحمانی تصور کیا جاتا' وہ سر کے بل شعلوں میں غلطاں جہنم رسید ہوتا ہے لیکن کہتا ہے کہ ''کیا ہوا کہ میدان ہار گئے ابھی بہت سے میدان باقی ہیں' ابھی ہمت باقی ہے'' مستقل مزاجی موجود ہے۔

اگر ہمت کا شناور مستقل مزاجی سے کام لیتا ہے تو سمندر بھی کنارہ بن جاتا ہے، موجیں کشتی کا کام دیتی ہیں لیکن ایسا اس لئے نہیں ہو پاتا کہ جس سماج میں ہم سانس لے رہے ہوتے ہیں وہ ہم سے ساری کی ساری آکسیجن چھین لیتا ہے اور ہمیں کٹھ پتلی بنا دیتا ہے' یہ سماج اخلاقیات بھی اپنی مرضی کی تراشتا ہے' سارا قصور غیبی قوتوں کا ٹھہراتا ہے کیونکہ ایسے میں اسے اپنے کالے کرتوت کرنے کا جواز مل جاتا ہے۔ اگر کوئی فرد اپنی انفرادیت باقی رکھنے کی سعی کرے اور اخلاقیات کی روح میں داخل ہو' مذہب کی تعلیم کو ٹھیک سیاق وسباق میں دیکھے' اگر تاریخ کے صفحات کا مطالعہ کرے' ہمت والوں کی زندگیوں کا مطالعہ کرے تو پھر وہ عظمت کا مینار بن جاتا ہے۔ پہاڑ حوصلہ رکھنے والے افراد کا ظہور انہی معاشروں سے ہوا ہے جو مایوسیوں کو جنم دیتے ہیں' صرف ضرورت اس امر کی ہے کہ مشکل کو اپنے سر پر سوار نہ کیا جائے' آزمائش کو آزمائش تصور کیا جائے اور بڑی سے بڑی افتادہ پر بھی حوصلے کی شمع روشن رکھی جائے تو یقیناً ہمت کے چراغ زندگی کو سنبھال لیتے ہیں اور ہر فرد اپنے مقدر کا ستارہ بنتا ہے اور نئی تاریخ رقم کرتا ہے' نئی کہانیاں بنتی ہیں' لافانی انسان جنم لیتے ہیں' لاثانی شخصیتیں ابھرتی ہیں۔

فرد اور معاشرہ دست و گریبان

معاشرہ زمینی جنت رہا ہے' اس کے صدیوں گن گائے گئے' اسے فرد کی پناہ گاہ تصور کیا گیا' معاشرہ فرد کی تمام حاجات کا کفیل گردانا گیا اور آج بھی معاشرے کی اہمیت سے کئی حوالوں سے انکار کرنا خاصا دشوار ہوگا۔ ایک زمانہ تھا' اسے پتھر کا زمانہ کہہ لیجیے یا قبل از تاریخ کا زمانہ' جب انسان جنگلوں میں رہتا تھا اور اپنی طاقت کی بنیاد پر اپنا رزق حاصل کیا کرتا تھا' اس کے سامنے کوئی معاشرتی اصول نہیں تھے وہ چاہتا تو خود اپنے جیسوں کو کھا جاتا۔ اس دور میں مردم خوری کے کئی شواہد تاریخ نے محفوظ کیے ہیں اور ایسے ماحول کی بو باس کہیں کہیں اب بھی محسوس کی جاتی ہے وہ دور جنگل کا دور تھا جنگل کا قانون نافذ تھا' یعنی جس میں طاقت ہو وہ اپنی ضروریات پوری کر لے' اس طرح انسان کی زندگی بڑی غیر محفوظ تھی' پھر آہستہ آہستہ شعور بیدار ہونے لگا۔ شاید یونانیوں کو پہلی بار خیال آیا کہ کچھ معاشرتی اصول ہونے چاہئیں جنہیں کوئی اہم فرد نافذ کروائے تا کہ انصاف یقینی ہو سکے' افلاطون اور ارسطو نے City states کا نظریہ پیش کیا اور پھر بعد میں آنے والے فلسفیوں نے اپنے اپنے نظریات دیئے اور یوں معاشرے کی داغ بیل پڑی لیکن پھر بھی انسانوں کو اپنی حفاظت خود ہی کرنا پڑتی تھی وہ اپنے شہروں کے گرد فصیلیں بناتے تھے' پناہ گاہیں تعمیر کرتے تھے' بڑے بڑے قلعے بنائے جاتے تھے ساتھ ہی ساتھ پنچایتی سسٹم بھی رائج ہو گیا تھا جس میں کچھ لوگ مل بیٹھ کر فیصلے کر دیتے تھے' پھر حکومتیں مضبوط ہوئیں اور امن وامان حکومتوں کا فرض ٹھہرا' لیکن حکومتیں ریاست کے ظاہری نظم ونسق تک محدود رہیں وہ معاشرتی مسائل کا پوری طرح احاطہ نہ کر سکیں۔

یہ صورت حال بڑی فکر انگیز تھی لیکن اس پر غور کسی نے نہیں کیا یا بہت کم غور کیا گیا۔

حکومت نے سڑکیں، پل، ادارے اور کارخانے تو بنائے لیکن وہ ان دیواروں کو نہ گرا سکی جو فرد اور معاشرے کے درمیان کھڑی ہو گئی تھیں۔ معاشرے کے لوگ ایک اکائی تو بنتے سے رہے لیکن کچھ رسوم و رواج، تعصبات اور توہمات نے انہیں جکڑ لیا۔ جاگیرداری اور قبائلی سوچ نے فرد کو یکہ و تنہا کر دیا۔ چند دقیانوسی افکار مکڑی کے جالے کی طرح فرد کے گرد نظر آنے لگے یہ سچ ہے کہ ان دقیانوسی خیالات کے علمبردار چند افراد ہی ہوتے تھے جو طاقت کی بنیاد پر اپنے آپ کو اہم بنا لیتے تھے اور پھر ہر طرف ان کا سکہ چلتا تھا۔ حکومتوں کو ان رسوم و رواج سے کوئی تعلق نہ تھا وہ اپنے آپ کو چند امور تک محدود رکھتی تھیں اس طرح آہستہ آہستہ انفرادی سوچ مٹ گئی۔ زرعی معاشرے میں تو ترقی کا تصور ہی مفقود تھا جو بات دادا سوچتے تھے وہی پوتے پڑپوتے کی سوچ ہونا ضروری تھی۔ تبدیلی گناہ تصور کی جاتی تھی، فرد کی کوئی اہمیت تھی ہی نہیں سب کو ایک انداز سے سوچنا ضروری تھا۔ سولہویں، سترہویں صدی نے سوچ میں کچھ تبدیلی پیدا کی لیکن یہ تبدیلی محض چند ممالک تک محدود رہی اور ان ممالک میں بھی دقیانوسی سوچ کو یکسر ترک نہیں کیا جا سکا۔ انگلستان میں بڑے بڑے مفکر پیدا ہوئے لیکن عوام الناس کی زندگیوں میں ہر جگہ تبدیلی نہیں آ سکی وہاں بھی سوچ پر پہروں کی ایک بڑی لمبی فہرست ہے بہرحال مغرب کے بعض ممالک میں بڑی حد تک تبدیلی آئی جس کے باعث معاشرتی ترقی بھی ہوئی اور سماجی انصاف بھی ملا۔ اس کے باوجود وجودیت جیسی تحریکیں ابھریں جنہوں نے فرد کی موت کے مرثیے پڑھے اور علم احتجاج بلند کیا اور واضح کیا کہ ہر فرد خود اپنے مقدر کا ستارہ ہے اس پر اسلوب حیات نافذ نہیں کیا جا سکتا اسے اپنی زندگی خود بنانے اور سنوارنے کا حق حاصل ہے کچھ لوگ باغی ہو گئے اور کچھ داخلیت کا شکار ہو گئے، اپنے من میں ڈوب گئے اور انہیں تن بدن کی کوئی ہوش نہ رہی۔

مشرق میں صورت حال کہیں زیادہ تکلیف دہ رہی، یہاں نئی سوچ کو مکمل طور پر رد کرنے کو عین ثواب گردانا گیا، اشتراکیت نے تو فرد کو بالکل مٹا کر رکھ دیا، وہ ایک جماعت کا ایسا رکن تھا جس کی کوئی اپنی شناخت نہیں تھی، اسے ناپ تول کے پیمانوں پر پرکھا جانے لگا۔

بالکل Guliver Travels کے Liliputians کی طرح یہ حساب لگایا جانے لگا کہ انسان کی مادی اور بنیادی ضروریات کیا ہیں اور بس' اس کے اندر کا لامحدود جہان اشتراکیت کا دردسر نہیں تھا، معاشرے کا فرض ہے کہ وہ فرد کی کفالت کرے فرد کو معاشرے کی سوچ میں ضم ہو جانا چاہیے۔ اشتراکیت کیساتھ ساتھ قبائلی اور جاگیردارانہ سوچ نے فرد کا جس طرح قتل عام کیا اس کے تصور سے روح اور بدن کانپ اٹھتے ہیں' اس نظام کے تحت ہر چیز پہلے سے طے شدہ ہے' ہر انداز' ہر طور طریقہ' ہر سوچ معاشرے کے زیر نگیں ہے' فرد کی کیا مجال کہ اپنی مرضی کا فیصلہ کرے' وہ خدا سے سرتابی کرے تو کرے' اپنے ماحول کے سامنے زبان کھولنے کی بھی اجازت نہیں ہونی چاہیے' وہ زبان کاٹ دی جائے گی جو معاشرتی روایات کے مطابق نہ ہو' وہ سر قلم کر دیا جائے گا جو بلند ہونے کی خواہش کرے' وہ قلم توڑ دیا جائے گا جس کی تحریر معاشرتی روایات اور رسوم و رواج کے مطابق نہ ہو۔ اس کے باوجود فرد نے اپنی قسمت کا فیصلہ کئی بار خود کرنے کی کوشش کی۔ جانے کتنے افراد کو یہ معاشرتی درندہ نگل گیا۔

یوں ہم دیکھتے ہیں کہ آج بھی معاشرے اور فرد میں ایک کشمکش جاری ہے اور شائد انسانی ارتقاء اسی کشمکش کے باعث ہوا؟ اگر سقراط زہر کا پیالہ نہ پی لیتا' اگر حضرت حسینؓ ، یزیدیت کے سامنے سرنگوں کر دیتے تو زندگی آگے نہ بڑھتی' زندگی بسا اوقات کربلا بنی' جانے کتنے حسین اپنی جانوں کا نذرانہ پیش کرتے رہے اور کرتے رہیں گے، زندگی اپنے ارتقاء کے لئے قربانی چاہتی ہے اور افراد یہ قربانی دیتے رہے ہیں' کبھی یہ قربانیاں پیامبروں نے دیں' کبھی فلسفیوں نے' کبھی شاعروں اور ادیبوں نے اور کبھی کبھی ایسے افراد نے جو نہ شاعر تھے، نہ ادیب ، نہ پیامبر تھے، نہ فلسفی لیکن ان کی روح بیدار تھی' ان کی عقل بے باک تھی ان میں جرات رندانہ تھی اور یہ افراد، یہ منچلے یہ دیوانے اور یہ فرزانے ہمیشہ پیدا ہوتے رہیں گے۔ ہمیشہ اپنی زندگیوں کا نذرانہ پیش کرتے رہیں گے اور ہمیشہ گلشن حیات میں بہاروں کا سامان فراہم کرتے رہیں گے۔ دقیانوسی اژدھے تعصب کے عفریت اور رجعت پسندانہ قوتیں بھی ہمیشہ گل کھلاتی

رہیں گی' خون بہاتی رہیں گی' تاریکیاں پھیلاتی رہیں گی لیکن رات کتنی ہی طویل ہو' صبح کو نمودار ہونا ہی ہوتا ہے' اندھیرے کتنے ہی گہرے ہوں انہیں چھٹنا ہی ہوتا ہے' نظام کتنے ہی مضبوط ہوں وہ فرد کی تخلیق روک نہیں سکتے' ہم روایت کے مثبت پہلوؤں کے منکر نہیں لیکن ہم جدت کی ندرت کی نعمتوں کے بھی پوری طرح علمبردار ہیں' زندگی تادیر ایک ہی راستے پر نہیں چل سکتی اسے نئے رستے' نئی شاہراہیں' نئی روشیں اختیار کرنا ہوتی ہیں کیونکہ اقتضائے حیات یہی ہے کہ انسان ہمیشہ نئے طور اور نئی برق تجلی کا متلاشی رہے کیونکہ اب بھی تخلیق کا عمل جاری ہے اور ہمیشہ جاری رہے گا۔ اشیاء اپنی تکمیل کو پہنچ جائیں' شائد وہ دن کبھی نہیں آئے گا۔

محبت کرنے والے کم نہ ہوں گے

مصرعے میں کمال کی رجائیت ہے' کمال کا حوصلہ ہے' کمال کا سمجھوتہ ہے لیکن اسی شعر کے اگلے مصرعے میں ایک عجیب کسک ہے' ایک عجب حرماں نصیبی ہے یعنی یہ کہ

تری محفل میں لیکن ہم نہ ہوں گے

لیکن اس سے کیا فرق پڑتا ہے بقول ناصر کاظمی

دائم آباد رہے گی دنیا
ہم نہ ہوں گے کوئی ہم سا ہو گا

ہم نہ ہوں گے کوئی ہم سا ہو گا زندگی رواں دواں رہے گی' زندگی کے کام جاری وساری رہیں گے' شکسپیئر کے المیوں کی طرح بدترین حالات میں بھی زندگی کی ندی بہتی رہے گی۔ شاید یہی زندگی ہے لیکن ذرا رکیئے! اس میں کتنی صداقت ہے کہ دنیا میں ہمیشہ محبت کرنے والے موجود رہیں گے اور ان کی تعداد بھی کم نہ ہوگی' کہیں یہ محض زعم تو نہیں' خام خیالی تو نہیں' طفل تسلی تو نہیں' لیکن اس سے زیادہ اہم مسئلہ یہ ہے کہ محبت ہے کیا؟ شاعروں اور ادیبوں نے محبت کی جتنی راگنیاں الاپی ہیں اس سے ساری کائنات گونجتی رہی ہے۔ خود روزمرہ زندگی میں بھی ہر ایک کی زبان پر وظیفہء محبت سنائی دیتا ہے لیکن کتنے ہیں جو محبت کا معنی اور مفہوم سمجھتے ہیں کاش کہ کچھ لوگ تو ہوتے' کچھ تو ہوتے کہتے ہیں کہ دل محبت کی آماجگاہ ہے مگر سائنس نے اس آماجگاہ کی حقیقت کو چیلنج کر دیا اور کہا کہ جذبوں کا منبع تو دماغ ہے' چلیئے اس سے کیا فرق پڑتا ہے کہ منبع دل ہے یا دماغ! کیا یہی کافی نہیں کہ منبع ہے تو' مگر دماغ عجب شئے ہے' جانے کیا کیا خیالات اور

افکار اس میں جنم لیتے ہیں اور اس نے موجودہ تقاضوں کے مطابق، مصلحت پیشی اور مصلحت بینی سیکھ لی ہے اور شاید روز اول سے سیکھ لیہے تو پھر محبت کی آماجگاہ ہے کہاں؟ ہے بھی یا نہیں، کبھی ہم ہونٹوں پر میٹھے میٹھے لفظوں کو محبت کا نام دیتے ہیں، کبھی محبت آنکھوں کی چلمن سے جھانکتی ہے، کبھی یہ رخسار کو اپنی رہائش گاہ بنا لیتی ہے، کبھی ہنستا گلاب جیسا چہرہ محبت کا امین ٹھہرتا ہے، تو پھر ہواؤں، فضاؤں میں محبت رس گھولنے لگتی ہے، صبح روشن تر ہو جاتی ہے اور رات دلکش تر۔ پھولوں کے رنگ زیادہ شوخ ہو جاتے ہیں، پھلوں میں حلاوت آ جاتی ہے۔ دستک کے ساتھ دل دھڑکنے لگتا ہے، گھنٹیاں جل ترنگ بن جاتی ہیں، تصویروں میں جان پڑ جاتی ہے، پاؤں کبھی اٹھتے ہی نہیں، اٹھتے ہیں تو ٹھہرنے کا نام ہی نہیں لیتے۔ شاعر، ادیب، موسیقار اور سنگ تراش آب حیات تخلیق کرنے لگتے ہیں۔ ان کے شعر آسمانی گیت بن جاتے ہیں اور نغمے کانوں میں رس گھولنے لگتے ہیں۔ جی چاہتا ہے کہ زندگی کے ماہ وسال صدیاں بن جائیں، لمحے ابد ہو جائیں، ہر طرف رنگ ونور کی بارش اور عید قرب ووصال کا سماں ہوتا ہے، کیا کہنے اگر یہی زندگی ہے تو پھر واعظ اپنی جنت اپنے پاس رکھے۔ لیکن پھر دل کا تار جانے اچانک کیوں ٹوٹ جاتا ہے، رباب ہستی نغمے الاپنا بند کر دیتا ہے، محبوب نظر ہرجائی دکھائی دیتا ہے۔ سب سراب تھا، کون کسی کو چاہتا ہے، سب مصلحت کیش، مصلحت پسند ہیں، سب قسمیں، سب وعدے جھوٹے، زندگی بھر کا ساتھ نبھانے کے ارادے کافور، کچھ بھی تو بس میں نہیں، آنکھ کھل جاتی ہے اور پھر ظالم اور سفاک حقیقت منہ چڑانے لگتی ہے۔

یہ سب کہنے کی باتیں ہیں

سب کہنے کی باتیں ہیں تو پھر محبت کا وجود ہے بھی یا نہیں، یہ سوال ہمیشہ سوال ہی بنا رہا، اس کا جواب ہی نہ مل سکا، شعر ہے

ہر ایک حرف سے پوچھا ہر ایک نقطے سے
مرا سوال مگر تشنۂ جواب رہا

اور یہ تشنگی' یہ تشنہ لبی تشنہ دہنی ہمیشہ قائم رہے گی' کوئی جواب دینے نہیں آئے گا۔ محبت کیا ہے' محبت کے نغمے محبت کے پیمان کیا حقیقت رکھتے ہیں۔

ع دل کے خوش رکھنے کو غالب یہ خیال اچھا ہے

محبت ہے یا نہیں ہے' کوئی محبت کرنے والا' چاہنے والا کبھی پیدا ہوا ہے یا نہیں' لیکن یہ کیا کم ہے کہ محبت کا احساس کبھی کبھی زندگی عطا کر دیتا ہے' روشنی عطا کر دیتا ہے' کچھ دیر کے لئے سبھی اندھیرے' اجالوں میں تبدیل ہو جاتے ہیں' ایک مسکراہٹ' ایک سرمایہ حیات بن جائے تو کیا مضائقہ ہے' اگر ایک نظر عطا کر دے تو کیا حرج ہے' اس میں کلام نہیں' سراب بہرحال سراب ہے لیکن کیا کہتے ہیں سراب کی دنیا میں سراب بھی بڑی شئے ہے چنانچہ یہ رجائیت یہ روشن خیالی کہ محبت کرنے والے ہمیشہ رہیں گے کچھ اس قدر غلط بھی ہیں اس لئے کہ محبت کرنے والے تو شائد موجود رہتے ہیں، دلوں میں محبت اپنی روشنی پھیلاتی ہے' تقویت دیتی ہے' عہد و پیاں، ارادے' قسمیں اور وعدے جھوٹے نہیں ہوتے' لیکن جاگیردارانہ قوتیں' استحصالی طاقتیں' خودغرضانہ منفعتیں باتوں کو ارادوں کو پنپنے ہی کب دیتے ہیں۔ اس لئے شکسپیئر کے ایک کردار نے کہا تھا

Our thoughts are ours

Their ends none of our own

ہم جب کوئی ارادہ کرتے ہیں تو ہم مخلص ہوتے ہیں' لیکن نتائج ہمارے بس میں نہیں ہوتے' محبت کا وعدہ، محبت کی قسمیں دلوں کی گہرائیں سے بلند ہوتی ہیں' پورا جسم پوری روح اس میں شامل ہوتی ہے لیکن ایک جسم ایک روح کا مقابلہ معاشرہ کے عفریت سے ہوتا ہے، رسم و رواج کے دیو سے ہوتا ہے' مصلحتوں اور منفعتوں کے اژدہے بڑے بڑے خوفناک ہوتے ہیں جو ہر شئے نگل جاتے ہیں' قسمیں اور ارادے تو کیا قسمیں اور ارادے رکھنے والے قصہ پارینہ بن جاتے ہیں۔ چنانچہ اس میں شک نہیں کہ محبت کا جذبہ ایک بار ضرور ابھرتا ہے مگر پھلنے پھولنے سے پہلے ہی بادسموم کا لقمہ بن جاتا ہے۔ ہم محبت کی طاقت سے چٹان کی طرح مضبوط ہو جاتے

ہیں، کوہ ہمالیہ کی طرح بلند ہو جاتے ہیں، سوچتے ہیں کہ ہم ہر شئے سے ٹکرا جائیں گے، ہر چیز کو توڑ پھوڑ کر رکھ دیں گے، کوئی ہے جو ہماری راہ میں حائل ہو، کوئی دریا، سمندر، صحرا ہماری راہ کو روک نہیں سکتا۔ مگر یہ نہیں جانتے ہم سے بڑی طاقتیں، کہیں بڑی طاقتیں! ہمارے ان وعدوں ان ارادوں پر قہقہے لگا رہی ہوتی ہیں اور وقت آتا ہے کہ ہم ان کے سامنے گھٹنے ٹیک دیتے ہیں بلکہ انہیں دیوتا مان لیتے ہیں۔ جسے ہم عین ثواب، عین مذہب اور عین ایمان کہتے تھے خود ہی اسے گناہ اور عذاب تصور کرنے لگتے ہیں۔ یہ تغیر یہ تبدل یہ انقلاب انسان کی توہین بھی ہے اور انسان کو انسان بھی بناتا ہے۔ فرد اور معاشرہ ہمیشہ دست و گریبان رہے ہیں لیکن فرد ہوتے کتنے ہیں، مٹھی بھر لوگ! بہتوں نے وقت کے سامنے گھٹنے ٹیک دیئے، مٹھی بھر ایسے ضرور ہوتے ہیں جو اشہب وقت پر سوار ہوئے اور اس کی باگیں اپنے ہاتھوں میں تھامیں، یہ فرہاد، یہ مجنوں، یہ رومیو، یہ منصور، یہ سرمد، یہ لنکن، یہ قائد، یہ اقبال ہمیشہ رہے پائندہ رہے لیکن اربوں انسانوں میں چند انسانوں کا مہاانسان ہونا یہ ثابت نہیں کرتا کہ زندگی کی راہ سہل ہے اس سے ثابت ہوتا ہے کہ زندگی سے نبرد آزما ہونا حالات سے دست و گریبان ہونا کوئی آسان کام نہیں، لیکن ایسا بھی نہیں کہ یہ ناممکن ہو، اگر ناممکن ہوتا تو پھر زندگی ٹھہر کر رہ جاتی، زہر کا جام پینے والے عمر جاودانی حاصل کرتے رہے ہیں، محبتوں نے جانے کن کن آندھیوں میں چراغ جلائے ہیں چنانچہ شاعر کا یہ قول

محبت کرنے والے کم نہ ہوں گے

محض دیوانے کی بڑ بھی نہیں، محبت ہمیشہ اپنے رنگ و نور بکھیرتی رہے گی، محبت کرنے والے ہمیشہ محبت کرتے رہیں گے، یہ الگ بات کہ یہ جذبہ، یہ قوت، یہ طاقت ہر ایک کے حصے میں نہیں آئے گی اور اسی طرح جہد حیات جاری رہے گی۔ لوگ محبت سے قوت حاصل کرتے رہیں گے، مرتے رہیں گے، جیتے رہیں گے، ایسے بھی ہوں گے جنہیں محبت امر کر دے گی۔ ایسے بھی ہوں گے جو محبت کو منہ نہیں دکھا سکیں گے۔

ہم جمہوریت چاہتے ہیں

بقول شاعر

ـــ ہم وہاں ہیں جہاں سے ہم کو بھی
اب ہماری خبر نہیں آتی

ہم اہلیانِ مملکت خداداد پاکستان کا کچھ یہی حال ہے کچھ ایسی گومگو کی کیفیت سے دوچار ہیں کہ ہیملٹ سے بازی لے گئے ہیں۔ ٹی ایس ایلیٹ کا Prufroc بھی ہمارے سامنے کیا حیثیت رکھتا ہے' ہم تو کبھی کبھی بلھے شاہ کی طرح کہہ اٹھتے ہیں بلکہ سمجھتے ہیں اور شائد یہ ہماری سمجھ جز وقتی نہیں بلکہ ہمہ وقتی ہے۔

ع بلّھا! کیہ جاناں میں کون؟

ہر مرحلے پر ہمارے سامنے بہت سے سوالات ہوتے ہیں جن کا جواب کوئی دینے والا نہیں یا شائد ہم لینا ہی نہیں چاہتے۔ مثال کے طور پر ہم پاکستان کو اسلامی ریاست بنانا چاہتے ہیں یا مغربی انداز کی جمہوریت؟ ہم سعی پیہم کے قائل ہیں یا تقدیر کے پجاری؟ ہم آزادیء نسواں کے قائل ہیں یا اسے صرف خاتونِ خانہ رکھنا چاہتے ہیں؟ ہم مرد و زن کے اختلاط کے قائل ہیں یا انہیں الگ الگ دیکھتے ہیں؟ ہمیں جاگیردارانہ نظام پسند ہے یا اشتراکی؟ اس طرح کے بہت سے سوالات ہیں جو ہم اپنے آپ سے کرتے ہیں اور کبھی بالکل نہیں کرتے' ہمارا حال کچھ یوں ہے کہ ہمیں کچھ بھی پسند نہیں اور سب کچھ پسند ہے' ہم کبھی چاند اپنی جھولی میں ڈال لینا چاہتے ہیں تو کبھی اسے محض ایک خیالی شئے تصور کر لیتے ہیں۔ ہم کبھی مافوق الفطری عناصر کے زیر تسلط ہوتے ہیں تو کبھی ہمیں سائنس کی عقلیت آ لیتی ہے۔ عجیب کیفیت ہے ہماری، عجیب

ماضی ہے ہمارا اور حال بھی عجیب اور پھر مستقبل بھی عجیب ہی ہوگا۔

قیام پاکستان سے ہم نے جمہوریت کا راگ الاپنا شروع کیا ہے اور قیام پاکستان ہی سے جاگیرداری' سرمایہ داری اور عسکری قوتوں کی دیویوں کی پوجا کی ہے۔ مطالبہ تو ایک فرد ایک ووٹ کا کیا ہے مگر ہزاروں ووٹ کسی ایک کی نذر اس لئے کر دیئے جاتے ہیں کہ وہ ہماری بگڑی بنا دے گا۔ ہمیں راتوں رات دولت مند بنا دے گا' ہماری تقدیر بدل دے گا' ہمارا مطالبہ تو بظاہر یہ رہا ہے کہ ہمیں کوئی نیک دل' نیک سیرت اور شائد نیک صورت حاکم مل جائے لیکن ہمارا یہ تقاضا رہا ہے کہ وہ حاکم' وہ قائد' وہ راہنما ہمارے تصورات اور تخیلات کی تخلیق ہو وہ ہماری قیادت نہ کرے ہم اسے پکڑ کر چلائیں' اگر وہ یہ کہے کہ صوبائی عصبیت غلط ہے تو ہم اسے غیر محبّ وطن کہیں' اگر وہ یہ چاہے کہ منشیات کا خاتمہ ہو جائے تو ہم اسے ختم کرنے پر تیار ہو جائیں' اگر اس کی خواہش ہو کہ فرقہ پرستی کی بجائے اسلامی اخوت کا بول بالا ہو تو ہم اسے کافر وزندیق کہیں' گردن زدنی قرار دیں' ہماری جمہوریت پرستی اور جمہوریت کے قربان! اس کی کوئی مثال نہیں ملتی ہم جمہوریت پسند ہیں لیکن خواہش ہماری ہے کہ راؤ صاحب کو ناظم بننا چاہیے' میئر بننا چاہیے' منسٹر بننا چاہیے' ہم جو راؤ ہوئے' ہم چوہدری ہیں' ہم شیخ ہیں' ہم خان ہیں بلکہ آپس میں لڑنے والے پہلوان ہیں اس لئے ہمارا اپنا آدمی برسرِ اقتدار ہو' ہمارے اپنے محلے کا' ہمارے اپنے شہر کا' ہماری برادری کا اور پھر وہ وہی قانون بنائے جو ہمارے بے لگام ارادوں کا تحفظ کر سکے' ہماری شان کو دوبالا کر سکے' وہ شان جس کے عناصر ترکیبی کلاشنکوف' دھینگا مشتی' منشیات فروشی، اقربا پروری اور بددیانتی ہیں۔

مصرعہ آج کچھ درد مرے دل سوا ہوتا ہے

جب میں سوچتا ہوں کہ ہم اپنے وعدے اور اپنے ارادے کیسے تبدیل کر لیتے ہیں' اقتدار کی ہوس رات بھر میں کسی کو وطن دشمن تو کسی کو وطن دوست بنا دیتی ہے۔ کل جس پارٹی کو ہم ملک کی تباہی کا ضامن سمجھتے تھے آج وہ پارٹی ہمارے اقتدار کی ہوس میں ہماری حلیف بن جاتی

ہے' ہماری ساتھی بن جاتی ہے' کل جو شخص ملک کو لوٹنے والا تھا آج وہ ملک کا بہی خواہ نظر آتا ہے۔ کبھی ہم فوجی غلبے کے لئے دعائیں کرتے ہیں تو کبھی ہم فوجی غلبے کو تمام تباہی کا ذمہ دار قرار دیتے ہیں۔ گزشتہ صدی کی آٹھویں دہائی میں کچھ حالات ایسے ہوئے کہ بڑے بڑے سورماؤں نے کمانڈر انچیف کو خط لکھے کہ ملک کی کشتی ڈانواں ڈول ہے۔ خدارا اسے سنبھالیئے اور پھر وہی سورما فوجی قیادت کو ہدف تنقید بنانے سے نہیں گھبراتے۔ جب حکومتیں سال بہ سال شکست و ریخت کا شکار ہونے لگتی ہیں تو ہماری نظریں افواج کی طرف اٹھتی ہیں اس میں کلام نہیں کہ افواج کا کام دفاع وطن ہے لیکن اس میں بھی کلام نہیں کہ جب جمہوری قوتیں تخریبی قوتیں بن جائیں تو دفاع پاکستان میں تحفظ پاکستان بھی شامل ہو جاتا ہے خواہ وہ تحفظ بیرونی ہو یا اس کا تعلق ملکی نظم ونسق سے ہو۔

میں نے اتنی تعلیم حاصل کر رکھی ہے کہ میں جمہوریت کے مفہوم سے واقف ہوں اور جمہوریت کی تاریخ بھی پڑھ رکھی ہے لیکن مجھے افسوس ہے کہ ہمارے عوام الناس کو جمہوریت کی روح سے آشنا ہی نہیں کرایا گیا۔ جمہوریت تعلیم کے بغیر پنپ ہی نہیں سکتی' جہاں خواندگی کی شرح اور ایسی خواندگی کی جو شعور عطا کرتی ہے ایک دو فیصد بھی نہ ہو وہاں یہ کیونکر ممکن ہے کہ جمہوری اقدار پھل پھول سکیں' ہمیں قائد کے انتخاب کا شعور ہو اور ہمیں احترام آدمیت سے آگہی ہو۔ وہ ملک جہاں امیر اور غریب میں زمین و آسمان کا فرق ہو جہاں ایک دولت مند ہزار مفلسوں کو خرید سکتا ہو وہاں One man one vote کا اصول کس طرح نافذ العمل ہو سکتا ہے۔ جہاں جمہوریت کی تشریح ہی ممکن نہ ہو اور یہی فیصلہ نہ ہو پائے کہ ہمیں اسلامی جمہوری نظام درکار ہے یا مغربی جمہوری نظام؟ تو وہاں جمہوریت کا پودا کس طرح پنپ سکتا ہے۔

ضرورت اس امر کی ہے کہ ہم انتہائی معاملوں پر ہم آہنگی پیدا کریں' ہماری پالیسیاں ملک گیر ہوں اور ملک کے مفادات پر ہر ایک کو یقین ہو' ضرورت یہ بھی ہے کہ ہم اپنے شہریوں کو شعور کی روشنی عطا کریں انہیں ماضی اور حال اور مستقبل پر نظر ڈالنے کی صلاحیت دیں' انہیں اقتصادی طور پر

اتنا مضبوط بنادیں کہ ایک آقا اور دوسرا غلام نہ نظر آئے بلکہ عملاً ایک صف میں سب کھڑے ہوئے نظر آئیں۔

اگر ہم ایسا نہیں کر پاتے تو ہمیں کسی انداز کی جمہوریت کے خواب بھی نہیں دیکھنے چاہئیں بلکہ سرے سے ہمیں خواب ہی نہیں دیکھنے چاہئیں' اب خواب کا نہیں بلکہ حقیقت کا دور ہے دشمن ہمیں پارہ پارہ کر دینا چاہتا ہے' ہماری اینٹ سے اینٹ بجا دینا چاہتا ہے' ہمیں نیست و نابود کر دینا چاہتا ہے اور ہم آپ بھی ایک دوسرے کی اینٹ سے اینٹ بجا دینا چاہتے ہیں' ایک دوسرے کو پارہ پارہ کر دینا چاہتے ہیں اور ایک دوسرے کو نیست و نابود کر دینا چاہتے ہیں۔ خدا ہمارا حامی و ناصر ہو' خدا ہمیں خود اپنے گریبان میں جھانکنے کی صلاحیت دے' اپنے چہروں کو آئینوں میں دیکھنے کی صلاحیت دے تاکہ ہم جمہوریت کی خواہش کے ساتھ ساتھ ملکی استحکام کی خواہش بلکہ اپنی بقاء کی خواہش بھی کرنے لگیں۔

(آمین)۔

یاں وہی ہے جو اعتبار کیا

اعتبار، عقیدہ، یقین، مفروضہ اور اسی طرح کے بہت سے الفاظ ہماری ذہنی کیفیت کے غماز ہوتے ہیں، ہم کچھ اشیاء پر یقین کر لیتے ہیں اس لئے نہیں کہ ہمارے سامنے بہت سے دلائل موجود ہوتے ہیں بلکہ بس جی چاہتا ہے اور پھر جی اپنی مرضی کے مطابق ایسے ایسے دلائل تراشتا ہے کہ اس کے سامنے کسی کے دلائل ٹھہر نہیں سکتے۔ دل کی اپنی دنیا ہوتی ہے، اپنی کائنات! اس میں کوئی جیتا ہے، کوئی مرتا ہے، کوئی دلکش ہوتا ہے، کوئی دلکش نہیں ہوتا، کسی کو دیکھنے کے لئے وجود تڑپ رہا ہوتا ہے اور کسی کو دیکھ کر زندگی حرام ہو جاتی ہے۔ بس دلوں کی اپنی منطق ہے۔ دلوں کی زمین عقائد کے لئے بڑی زرخیز ہوتی ہے اگر آپ اکیسویں صدی میں دل کی دنیا کے منکر ہیں تو ہمیں کوئی گلہ نہیں، آپ ذہن کی دنیا کہہ لیجیئے، فکر کی کائنات قرار دے دیجیئے، سوچ کا جہان کہہ لیجیئے، بات وہی ہے، بات یقین اور عقیدے کی ہے اور شائد ہم اس لئے زندہ ہوتے ہیں کہ ہمیں جینے کا یقین ہوتا ہے، ہم نے بہت سے جیتے جاگتے، صحت مند توانا انسانوں کو موت سے دوچار دیکھا ہے ان کے خیال میں وہ پیدا ہی کب ہوئے تھے، زندگی نے انہیں دیا ہی کیا ہے؟ یہ زندگی ہے؟ مشکلات سے بھری زندگی، Tess نے کہا تھا ''ملعون ہو وہ رات جب میں نے اپنی ماں کے جسم میں وجود لیا تھا اور ملعون ہو وہ دن جب میں پیدا ہوئی تھی'' ایک Tess پر ہی کیا موقوف جانے کتنے جیتے جی موت سے بغل گیر رہتے ہیں اور کچھ ایسے بھی ہوتے ہیں جن کے لئے زندگی سچ مچ ایک بہت بڑی آزمائش ہوتی ہے۔ امریکہ کی ہیلن کیلر کو لے لیجیئے۔ نہ سماعت ہے، نہ بصارت اور نہ قوتِ گویائی، ہاں مگر جینے کی آرزو ہے، اک تڑپ ہے، ایک حوصلہ ہے جو اسے زندگی کی تمام نعمتوں سے نواز دیتا ہے اور جریدہ ءحیات پر ان منٹ نقوش ثبت کر دیتا ہے۔ جانے اور کتنی ہیلن کیلرز ہیں جن کی زندگیاں ان کے لئے ابتلاء و

آزمائش کے سوا اور کچھ نہ تھیں لیکن انہوں نے اپنے عزم اور حوصلے سے یقین اور عقیدے سے نت نئے زمین و آسمان تراشے۔

مان لیجیئے! ذرا سا تامل بھی کیجیئے کہ یقین کہ شمع اور عقیدے کے آفتاب و مہتاب تیرہ و تار زندگی کو بقعہء نور بنا دیتے ہیں۔ عقیدے کے لئے کوئی ٹھوس بنیادوں کی کوئی خاص ضرورت نہیں ہوتی، بس اتنا کافی ہے کہ آپ کو اس کا یقین ہے۔ یقین اور عقیدے نے ایسے گل و سوسن کاشت کئے ہیں جن کے رنگ و بو سے زندگی شاد کام ہوتی ہے۔ آپ کو یقین ہے کہ آپ کا اچھا عمل آپ کی زندگی میں ایک بہت بڑا سنگ میل ہے، آپ وثوق سے کہتے ہیں کہ آپ کو ہر عمل کا جواب دینا ہوگا، آپ کو جنت ملے گی، برے اعمال کے عوض آپ کو واصلِ جہنم کر دیا جائے گا۔ آپ کا یہ عقیدہ آپ کو برائیوں سے بچاتا اور اچھائیوں سے سرفراز کرتا ہے۔ آپ کو یقین ہے کہ آپ راہ حق میں لڑ کر شہادت حاصل کر لیتے ہیں۔ پھر ایک کیا ڈھیروں زندگیاں اگر میسر ہوں تو بھی راہ حق میں قربان ہیں۔ آپ جانتے ہیں کہ محنت کا انعام ضرور ملتا ہے پھر کیا ہے آپ دن رات اپنے مقصد کے حصول میں منہمک ہو جاتے ہیں اور کوئی مشکل بھی راہ حائل نہیں ہوتی۔

یقیناً عقائد منفی بھی ہوتے ہیں یہ عقیدہ کہ آپ بے بس اور مجبور ہیں آپ کو با اختیار ہوتے ہوئے بھی بے اختیار بنا دیتا ہے۔ یہ تصور کہ زندگی میں سچ کا کوئی مقام نہیں آپ کو دروغ گوئی کی بدترین کیفیت میں مبتلا کر دیتا ہے آپ کا یہ عقیدہ کہ سب ٹھیک ہے سب ٹھیک ہو جائے گا بسا اوقات آپ کو بے عمل زندگی کی راہ پر گامزن کر دیتا ہے۔ لیکن عقائد تو اکثر و بیشتر نازل ہوتے ہیں، اترتے ہیں، رم جھم، رم جھم کی صورت کشت حیات کو سرسبز و شاداب کر دیتے ہیں، کبھی عقائد وراثت میں ملتے ہیں تو کبھی معاشرتی زندگی اور ماحول انہیں انتہائی خوبصورت پیکنگ میں آپ کی نذر کرتے ہیں۔ کبھی کتابیں آہستہ آہستہ غیر شعوری طور پر آپ کے دل و دماغ کے نہاں خانوں میں عقائد کی شمعیں روشن کر دیتی ہیں یا کبھی آپ کو خبر بھی نہیں ہوتی ہے اور عقائد آپ کے سر پر سوار ہو جاتے ہیں۔ ہمیں اس سے غرض نہیں کہ ایسا کیوں ہوتا ہے، ہاں ہم اتنا

جانتے ہیں کہ ایسا ہوتا ہے، اگر ہوتا ہے تو پھر کون روک سکتا ہے۔ آپ سائنس کی دنیا میں جتنے چاہتے ہیں انقلاب لے آئیں حقائق اپنی تمام تر سچائیوں کے ساتھ جلوہ گر ہو جائیں لیکن عقائد کا بال بیکا نہیں کر سکتے اکیسویں صدی میں انتہائی ترقی یافتہ اقوام اور مہذب ممالک اپنے صدیوں کے عقائد کے بل بوتے پر زندہ ہیں، انکے خیالات تحقیق اور تدقیق سے کوئی علاقہ نہیں رکھتے۔ ان کی تحقیق مادی اشیاء تک محدود ہے، بہت سے دل ودماغ کے مسائل کی رسی عقائد کے ہاتھوں میں ہے۔ تو پھر عقائد کی اہمیت سے کون انکار کر سکتا ہے، ہمیں بھی انکار نہیں۔ آپ بڑے شوق سے اپنے عقائد کی آبیاری کیجئے، اپنے مفروضوں کو پروان چڑھایئے، توہمات کی زلفوں سے کھیلیے اپنے نظریات کی تشریح وتوضیح من چاہے انداز سے کیجئے مگر ہماری اتنی خواہش ضرور ہے کہ جہاں آپ اپنے عقائد کو الہامی گردانتے ہیں، محترم سمجھتے ہیں، ان پر مرمٹ جاتے ہیں، وہاں دوسرون کو بھی اپنے عقائد، اپنی آراء، اپنے تصورات کی شمع کو روشن کرنے دیجئے، اگر آپ کا حق ہے کہ آپ زندگی کا اسلوب حیات اپنی مرضی سے تراشیں تو دوسرے کا بھی یہی حق ہے۔ مسائل بلکہ تباہ کاریاں اور ہلاکت خیزیاں اس وقت جنم لیتی ہیں جب آپ اپنے عقیدے کو ہی واحد عقیدہ تصور کر لیتے ہیں اور دوسروں کے عقائد اور نظریات کو کوئی اہمیت نہیں دیتے۔ اگر ایسا ہے تو یاد رکھیے کہ آپ کے عقائد ہی معرض خطر میں ہیں۔ ممکن ہے کہ کوئی اور عقیدہ رکھنے والا آپ سے زیادہ طاقتور ہو جائے، کوئی ایٹم بم بنالے، کوئی آسیب تراش لے، کوئی دیو اپنے تصرف میں لے آئے، پھر آپ کا کیا بنے گا؟ اگر عقائد کی زندگی کا انحصار طاقت اور قوت پر ہی ہو تو پھر عقائد کی زندگی چند روزہ ٹھہرے گی، طاقت اور قوت تو ایک ایسی ہرجائی محبوبہ ہے جو کسی ایک کی نہیں ہوتی کل ایران اور رومیوں کا دبدبہ تھا تو پھر عربوں نے جاہ وچشم حاصل کر لیا پھر یہ طاقت کسی اور کی باندی بن گئی حال ہی میں روس ایک ناقابل تسخیر قوت تھی آج یہ قوت آپ کے سامنے زمین پر رینگ رہی ہے۔ آج امریکہ کا بول بالا ہے لیکن کون جانتا ہے کہ کل کیا ہوگا؟ کل کس نے دیکھی ہے؟ چنانچہ اگر عقائد اور نظریات کی بقاء کے لئے قوت کو ضروری گردانا جائے تو

پھر آپ اپنے عقائد کی خیر منائیے لیکن آپ کو تو اپنے عقائد بہت پیارے ہیں کیونکہ وہی واحد سچ ہیں، اٹل حقیقت ہیں، تو پھر اگر جان کی امان پاؤں تو عرض کروں کہ حضور مجھے بھی اپنے عقائد بہت پیارے ہیں' بہت محترم ہیں' مجھے بھی اپنے عقائد پر چلنے کا کم از کم اتنا حق دیجئے جتنا آپ اپنے آپ کو دینا چاہتے ہیں' لیکن اگر آپ آج اپنی قوت اور طاقت کے بل بوتے پر مجھ سے میرا حق چھینتے ہیں تو میں بھی کوئی آسانی سے اپنا حق چھینے نہیں دوں گا اور قوت اور طاقت حاصل کرنے کی ہر ممکن کوشش کروں گا اور جوں ہی مجھے قوت مل گئی تو پھر آپ کو اپنے پیارے عقائد سے ہاتھ دھونا پڑیں گے۔

ہماری رائے میں عقیدہ اور یقین ہر انسان کا پیدائشی اور بنیادی حق ہے لیکن ضروری ہے کہ ہر شخص یہ بات پہچان لے اور باور کرلے کہ اس دنیا میں وہ تنہا نہیں۔ چھ ارب نفوس اس کرہ ارض پر آباد ہیں سب کو حق حاصل ہے کہ وہ اپنی مرضی کے مطابق زندہ رہیں اپنی خواہشات کی حتی المقدور تکمیل کرنے کی سعی کریں۔ اگر یہ بات ہماری سمجھ میں آجائے تو پھر سب طوفان اور آندھیاں ٹل جائیں' طاقت اور قوت کا غیر انسانی استعمال ختم ہوجائے زندگی کے تھیٹر پر کھیلا جانے والا خونی ڈرامہ اپنے اختتام کو پہنچے' ہر لمحے خوف کا آسیب ہمارے تعاقب میں نہ رہے، راتیں ہماری دن ہمارے ہوں' ہم مشرق و مغرب کے گوشے گوشے سے اکتساب فیض کریں۔ زندگی سے کھیلیں' اٹھکیلیاں کریں بھیانک خواب ختم ہوجائیں اندھیری راتیں روشن ہوجائیں' پر کیا کیجیئے کہ ہر شخص نے، ہر جماعت نے، ہر قوم نے اپنے عقائد کی حفاظت کے لئے ایک لشکرِ جرار تیار کر رکھا ہے، اگر یہ لشکر جرار صرف تحفظ کا کام کرے تب بھی خیر ہے مگر اس کا کام یہ ہے کہ وہ دوسرے اقوام اور ممالک کے عقائد پر شب خون مارے اور ان کے خون سے ہولی کھیلے۔ یہی وجہ ہے کہ تمام تر علم و آگہی، دانش اور فراست تجربے اور تاریخی حقائق کے باوجود سکون جیسی نعمت کہیں موجود نہیں اور چھ ارب نفوس میں سے کم و بیش ایک دو ارب اشخاص ہاتھ میں تلوار لئے دلوں میں خنجر سنبھالے روحوں میں نشتر تھامے راہوں میں کانٹے بچھائے ہمہ وقت تیار ہیں، ایک

دوسرے کے خون کے پیاسے' ایک دوسرے کی موت کے طالب، ایک دوسرے کی زندگی کے دشمن، افسوس صد افسوس! دانائی شعور اور آگہی کیا ہوئے، ہر ایک کو رہنے کے لئے ایک گھر چاہیے ایک جگہ چاہیے اور جگہ اور گھروں کی کمی بھی تو نہیں لیکن ہمارے تعصبات ہماری خود غرضیاں ایسا کہاں ہونے دیں گی۔ کاش! اگر یہ حقیقت سب پر منکشف ہو جائے تو پھر نہ کشمیر کا مسئلہ باقی رہے، نہ فلسطین کا، نہ امریکہ کو کھربوں ڈالر اپنے حفاظتی نظام پر خرچ کرنا پڑیں اور نہ باقی طاقتوں کو اپنی آمدنی کا ساٹھ ستر فیصد ہتھیاروں کے خریدنے پر خرچ کرنا پڑیں، بات کتنی آسانی سے سمجھ میں آنے والی ہے بات ہم سب جانتے ہیں زندگی ایک بار ملتی ہے بار بار نہیں' خوشی، جان بخش اور روح افزاء کیفیت ہے' لیکن جانے کیوں عملی زندگی میں ہم ایسا نہیں کر پائے کہ خوش خوش رہیں اور خوش خوش رہنے دیں' خود کھائیں خوب کھائیں اور دوسروں کو کھانے دیں۔ قدرت کی فیاضیاں کم نہیں' زمین بہت وسیع ہے نہ خوراک کی کمی ہے نہ اسباب کی' قلت شائد وہ صبح طلوع ہو وہ سہانی صبح، وہ روپہلی صبح جب پوری دنیا اتنا اکٹھا کرے جتنے کی اسے ضرورت ہے' اتنا کھائے جتنا اسے درکار ہے' جانوروں سے سبق سیکھیں حشرات الارض سے روشنی حاصل کریں یہ صبح، یہ روشن صبح ضرور طلوع ہوگی اسے طلوع ہونا پڑے گا کیونکہ یہ اقتضاء فطرت ہے اور ہم فطرت سے تادیر بغاوت نہیں کر سکتے۔

اول خویش

تہذیب وشائستگی، مذہب اور روحانیت نے ایثار وقربانی کو ہمیشہ اولیت دی ہے۔ اسلام کے سنہری دور میں ایثار، جاں سپردگی اور جان کو دوسروں کے لئے قربان کر دینے کی مثالیں بھری پڑی ہیں۔ خود پانی نہیں پینا، دوسرے کو دے دینا، چاہے جان چلی جائے۔ اگر کوئی صدا دے دے تو سب کچھ اس کے حوالے۔ یہ صورت حال بڑی حوصلہ افزاء ہے، بہت ہی دل خوش کن۔ ہمارے اسلامی ممالک میں آج بھی آپ کو ایسی مثالیں مل جائیں گی جہاں دوسرے ممالک کے لوگوں کے لئے سب کچھ قربان کر دینے کا جذبہ موجود ہے خاص طور پر وطن عزیز کے سپوت یہ فریضہ انتہائی جوش وخروش اور والہانہ پن سے ادا کرتے ہیں۔ یہ سب کچھ بہت اچھا ہے، بہت ہی Idealistic لیکن اگر احادیث نبوی ﷺ کا مطالعہ کیا جائے تو پتہ چلے گا کہ ہماری جان کا بھی ہم پہ حق ہے ہمارے اہل خانہ بھی ہماری توجہ کے مستحق ہیں، اگر کوئی پڑوسی بھوکا سو گیا اور ہم پیٹ بھر کر سوئے تو ہمارا ایمان ساکت ہے، اگر اہل شہر کو مسائل درپیش ہوں تو ہمارا فرض ہے کہ ہم سب کچھ ان کے مسائل کو حل کرنے میں صرف کر دیں، اگر اسلامی نظام حیات کا بنظر غائر مطالعہ کیا جائے تو پتہ چلے گا کہ اپنی ذات کے بارے میں بھی انسان پر بڑے حقوق ہیں۔ ہماری رائے میں یہ نقطہ نظر بھی خودغرضانہ نہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ اگر آپ کے گھر والے بھوکے ہوں اور آپ ان کا کھانا محلے میں تقسیم کرتے پھریں تو یہ کوئی آئیڈیل صورت حال نہیں کیونکہ آپ کے بچوں اور دیگر اہل خانہ کو بھی آپ کی ضرورت ہے۔ آپ کی محبتوں کی، آپ کی شفقتوں کی، آپ کی توجہ کی۔ ایسے سماجی کارکنوں کی کمی نہیں جو پورے شہر کو خوشیاں دینے کا تو علم لئے ہیں لیکن اہل خانہ ان کی ایک جھلک کو بھی ترستے ہیں، انہیں ان کا ایک میٹھا بول بھی میسر نہیں، میں نے کئی سماجی مصلحین کی بیٹیوں کو سسکیاں لیتے ہوئے دیکھا ہے جب میں نے ان سے پوچھا کہ

ان کی پریشانی کی کیا وجہ ہے تو وہ پھوٹ پھوٹ کر رو پڑیں اور کہنے لگیں کہ "ابو سب کے لئے ہیں' سارے شہر کا درد ان کا درد ہے لیکن انہوں نے کبھی ہم سے یہ تک نہیں پوچھا کہ ہمارے مسائل کیا ہیں" بطور استاد مجھے ایسی کئی طالبات سے سابقہ پڑا ہے' لڑکے تو اپنے غم کسی نہ کسی کے ساتھ بانٹ ہی لیتے ہیں' دل بہلانے کو انہیں کوئی نہ کوئی مل ہی جاتا ہے یا ان کے اعصاب اتنے مضبوط ہوتے ہیں کہ وہ سب کچھ برداشت کر لیتے ہیں یا پھر وہ بے التفاتی اور بے توجہی کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر دیکھنے کی سکت پیدا کر لیتے ہیں لیکن جو ایسا نہیں کر پاتے ان کی یہی کیفیت ہوتی ہے۔

بہت سے احباب اعلائے کلمۃ الحق کے لئے اپنے گھروں کو خیر باد کہتے ہیں اور شہر شہر' بستی بستی' کوچہ کوچہ پھرتے ہیں' دستک دیتے ہیں اور اہل خانہ کو ان کے فرائض یاد دلاتے ہیں' مجھے ان کے خلوص پر کبھی بھی شک نہیں ہوا اور ہمیشہ ان کی کوششوں کو تحسین کی نظر سے بھی دیکھا' لیکن اگر کبھی موقع ملا تو ان مبلغین اسلام سے یہ استفسار ضرور کیا کہ کیا اپنے محلے میں اپنے علاقے میں' اپنی بستی میں وہ دروازوں پر دستک دے کر یہ پوچھتے ہیں کہ تمہارے مسائل کیا ہیں 'تم میں سے کون بیمار کون بھوکا ہے' کس کا بچہ پڑھ نہیں سکتا' اور پھر پتہ چلنے پہ اپنی خدمات پیش کی ہیں' ایسے سوالات کے جواب اکثر و بیشتر تسلی بخش نہیں ملے بلکہ اکثر احباب کی تبلیغ کے مراکز اپنا محلّہ اور اپنا علاقہ نہیں ہوتے ۔ مجھے معلوم نہیں کہ اس کی کیا وجہ ہے کہ ایک وجہ تو یہ بھی ہوسکتی ہے کہ وہ اپنے آپ کو بطور مبلغ پیش ہی نہ کر سکتے ہوں کیونکہ ان کے اہل خانہ اور اہل شہر ان کی کارگزاریوں سے خوب خوب واقف ہوتے ہیں ۔ دراصل دوسروں کے گلی محلوں میں چراغ روشن کرنے والے اپنے گلی محلوں کی تاریکیوں کا اکثر و بیشتر خیال نہیں رکھتے اور یہیں سے ایسی کوششوں پر سوالیہ نشان لگانا پڑتا ہے۔ ہمارے خیال میں ایثار کا آغاز اپنے گھر سے شروع ہونا چاہیئے' وہ بیٹا جو اپنی بوڑھی ماں اور بیمار باپ کو سکون نہیں دے سکتا خدا اور اس کے رسول ﷺ کو اس کے اس ایثار کی کوئی ضرورت نہیں جس کا مظاہرہ وہ کہیں اور جا کر کرتا ہے۔ اگر کسی شخص کو

اپنے محلے کی چیخیں سنائی نہیں دیتیں تو اسے دوسروں کے محلوں کی چیخ و پکار کیونکر سنائی دے جاتی ہے۔

ضرورت اس امر کی ہے کہ تہذیب وشائستگی، مذہب و دین کی اصل روح کی شناخت کی جائے' اہل وطن جہاد کے لئے دوسرے ممالک میں جانے کے لئے کمر بستہ ہیں اور اپنی جانیں' جان آفرین کے سپرد کر دیتے ہیں لیکن ضرورت اس امر کی بھی ہے بلکہ یہ ضرورت کہیں اور زیادہ ہے کہ مجاہدین اسلام جہالت' غربت' کسمپرسی' بیماری کے عفریت کے خلاف بھی برسر پیکار ہوں' کیا کبھی وطن عزیز کے سرفروشوں کو یہ خیال آیا ہے کہ وہ ناخواندگی کے خلاف صف آرا ہوں ملک میں امن وامان کے لئے بے تاب ہوں' قارئین کرام! ہم سب کہتے ہیں کہ آج کا دور صنعت وحرفت کا دور ہے، آج جو ملک اقتصادی طور پر مضبوط ہے دراصل وہی مضبوط ہے' اور مضبوط اور توانا ممالک ہی توانا اور تندرست کارنامے سرانجام دے سکتے ہیں۔ کیا یہ ممکن نہیں کہ ہمارے سرفروشان اسلام اور محبت و الفت کے پرستار اپنے ملک میں دہشت گردی' فرقہ پرستی کے اژدہوں کے خلاف صف آراء ہو جائیں تا کہ عبادت گاہیں 'شاہراہیں' گھر اور گلی کوچے محفوظ و مامون ہو سکیں اور پھر وطن عزیز میں کارخانے لگیں' فیکٹریاں کام کرنا شروع کر دیں' کالج اور سکول آباد ہوں' مسجدوں اور عبادت گاہوں میں اعلائے کلمتہ الحق ہو' ملک میں سرمایہ کاری ہو' اقتصادی ترقی ہو اور پاکستان ناقابل تسخیر بن جائے۔

قوموں کی زندگی کے حوالے سے ابھی یہ کل کی بات ہے کہ امریکہ' برطانیہ کی کالونی تھا' آزاد ہوتے ہی اس نے صنعت وحرفت میں ترقی کی' علم کو اوڑھنا بچھونا بنایا اور اپنی صفوں میں اتحاد اور اتفاق پیدا کیا' تہذیب اور شائستگی کے اصولوں کو اپنانے کی ہر ممکن سعی کی اور دیکھتے ہی دیکھتے ساری دنیا کا منصف اور مسیحا بن بیٹھا ہے۔ اس کا انصاف عالمی انصاف ہے اس کی ترجیحات' شائستگی اور تہذیب کی کسوٹی ہیں، جو اس ملک کے لئے

مفید ہے اسی میں ساری دنیا کی بھلائی اور خیر ہے۔ سب جانتے ہیں کہ سچ کیا ہے اور جھوٹ کیا ہے لیکن وہ جو دوسروں کو ٹکڑے دیتا ہو اور وہ جو اس سے ٹکڑے لیتے ہوں، اس کی خیرات پر پلتے ہوں، بس وہ لاکھ روحانیت اور تہذیب وشائستگی کی بات کریں بات بنتی دکھائی نہیں دیتی۔ جاپان اور جرمنی طاقت ور قوموں کا لقمہ بنے لیکن کہیں ان کی رگوں میں عزت و ناموس کا خون دوڑ رہا تھا خون کے ان سرچشموں کو بند نہیں کیا جا سکا اور یہ ممالک پھر دوسرے ممالک کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر انہیں دیکھ سکتے ہیں۔

اگر نبی پاک ﷺ کی حیات طیبہ کا مطالعہ کیا جائے اور ان کے فرامین کو یکجا کر کے دیکھا جائے تو پتہ چلے گا کہ اسلام کس قدر جدید، قابل عمل اور متوازن دین ہے۔ نبی پاک ﷺ کو جب ہجرت کی ضرورت پڑتی ہے تو ہجرت کر لیتے ہیں، صلح حدیبیہ کے معاہدے پر دستخط کرتے ہیں، میثاق مدینہ تحریر ہوتا ہے، غیر مسلموں کی خاطر و مدارت ہوتی ہے اگر کوئی مہمان آ جائے خواہ اس کا تعلق کسی مذہب، کسی علاقے سے ہو اس کی پوری تالیف قلبی کی جاتی ہے، امن وسکون کا پیغام عام کیا جاتا ہے، خون کے پیاسے اہل مکہ دیکھ رہے ہیں، اسلام کا لشکر جرار مکہ میں داخل ہو گیا ہے لیکن جان کے دشمنوں کا گھر دارالامان قرار پاتا ہے، کیا تاریخ عالم کوئی ایسی مثال پیش کر سکتی ہے؟ ہم مسلمان، ہم کلمہ طیبہ پڑھنے والے، صرف ایسے واقعات کو اپنے مقررانہ جوہر دکھانے کے لئے تو استعمال کرتے ہیں لیکن اسے اپنی زندگی نہیں بناتے، غیر مسلم تو غیر مسلم ہم تو اپنے اہل عقیدہ کو بھی معاف کرنے کو تیار نہیں۔ مصلحتیں وقتی طور پر ہمیں مجتمع کر دیتی ہیں، جب وقت گزر گیا تو ہمارے عہد و پیاں بھی گئے دنوں کی حسین یاد بن جاتے ہیں۔ آج وطن عزیز میں اسلامی جماعتیں یکجا نظر آتی ہیں۔ کیا شیعہ، سنی، وہابی، دیوبندی مل جل کر گلی محلوں مسجدوں اور عبادت گاہوں میں یکجا نظر آنے لگے ہیں؟ کیا فروعی اختلاف بالائے طاق رکھ دیئے گئے ہیں؟ کیا ایک دوسرے کو کافر کہنے کی ریت پرانی ہو گئی؟ کیا ہم اپنی کتابوں میں اتحاد و یگانگت کا پرچار کرنے کا عہد کر چکے ہیں؟ کیا ہم اب ایک

مسلمان قوم کی حیثیت سے جینے کی قسم کھا چکے ہیں؟ کیا ہم نے روح اور جسم کے تقاضوں کو پورا کرنے کا عہد کر لیا ہے؟ کیا ہم یہ ثابت کر دیں گے کہ اسلام اکیسویں صدی کے تقاضوں پر پورا اترنے کی صلاحیت رکھتا ہے اور یہ کہ ہم پاکستان کو روحانی' اقتصادی اور صنعتی طور پر اتنا مضبوط بنا دیں گے کہ دشمن اس پر نظر بد ڈالنے سے پہلے کئی بار سوچے گا؟ کیا ہم چودہ کروڑ نفوس ایک سیسہ پلائی ہوئی دیوار کی طرح مضبوط ہو گئے ہیں؟ اگر ایسا ہے تو ہمیں ہمہ وقت شکر بجالانا چاہیے' اور اگر ہمارا اتحاد و اتفاق مخصوص تقاضوں کی پیداوار ہے تو پھر لمحہ فکریہ ہمارے لئے موجود ہے۔ اقوام صدیوں میں بنتی ہیں ضرورت اس امر کی ہے کہ ہم پاکستانیت کو بھی خاطر میں لائیں اور یہ ثابت کر دیں کہ پاکستان اسلام کا قلعہ ہے اس قلعہ میں رہنے والے محفوظ و مامون ہیں لیکن اگر ہم اس قلعے کے دکھوں کو نہیں سمجھتے تو ہمیں اس قلعے سے باہر کے دکھوں پر چیخ و پکار کرنے کا کیا حق حاصل ہے، ہمیں اس قلعے کو مضبوط کرنا ہے، جب یہ قلعہ نا قابل تسخیر ہو جائے گا تو پھر ہم اس طرح کے کئی اور قلعے تعمیر کر سکیں گے، کئی ملک بسا سکیں گے خوشحال' خود کفیل اور پر اعتماد ممالک۔ اسلامی ممالک کی اب بھی تعداد ستاون ہے، یہ ستاون ممالک، یہ ایک ارب پچیس کروڑ نفوس جان کنی کے عالم میں کیوں ہیں؟ انہیں کس کی نظر لگ گئی؟ انہیں کون سی بیماری لاحق ہے؟ ہمیں اس پر غور کرنا چاہیے اور اگر ہم ایسا کر سکیں تو اصلاح احوال کی صورت نکل سکتی ہے اور خدا کی رحمت نازل ہو سکتی ہے وگرنہ فتنہ پرور اور فتنہ پرداز اشخاص خواہ وہ اپنے آپ کو کوئی نام دے لیں خدا کی رحمتوں کے حقدار نہیں ہو سکتے۔

انسانیت کے قبرستان

جسمانی موت کے بعد جو قبرستان آباد ہوتے ہیں ان کے نام ونشان تو عوام الناس کی آنکھوں کے سامنے ہوتے ہیں ۔ ہر کوئی ایسے قبرستانوں سے واقف ہے اور وقت ملے تو وہاں جا کر اپنی آخرت کو یاد کرنے کی سعی بھی کرتا ہے اور اگر وقت نہ بھی ملے تب بھی اپنے عزیزوں' اپنے رشتہ داروں اور دوستوں کی تدفین کے حوالے سے ان خاموش جہانوں کی سیر ہو ہی جاتی ہے۔

موت پر حسرت یہ کہتی تھی امیرؔ
آئے تھے دنیا میں اس دن کے لئے

لیکن کچھ ایسے قبرستان اور گورستان بھی ہیں جن کی خبر تک ہونے نہیں پاتی مگر وہ آباد ہوتے رہتے ہیں' پھیلتے رہتے ہیں' المیہ یہ ہے کہ ان قبرستانوں کا کوئی محل وقوع نہیں ہوتا' یہ چھوٹی سی جگہ میں بھی آباد ہو جاتے ہیں اور بڑے بڑے خطوں پر بھی ان کی حکمرانی قائم ہو جاتی ہے۔ یہ قبرستان مردوں ہی کو نہیں بلکہ زندوں کو بھی ابدی نیند سلا دیتے ہیں' جس کو چاہا پکڑ لیا اور قبر کے سپرد کر دیا' منوں مٹی پھینک دی مگر نام ونشان تک بھی معلوم نہ ہونے دیا' یہ قبرستان ہیں علاقائیت کے قبرستان' زبان کے قبرستان' اقربا پروری کے قبرستان' مشرق ومغرب کے قبرستان' مذہبی جنون اور تہذیبی تعصّبات کے یہ شہر اور گاؤں پھیلتے ہی چلے جا رہے ہیں۔

ایک قبرستان جس کی میں آپ کو سیر کروانا چاہتا ہوں' تعصّبات کا قبرستان ہے' بڑا ہی بھیانک تیرہ وتار' خوں خوار' درندہ صفت' وحشی نژاد' آدم خور' آدم کُش' اس قبرستان کے انہدام کے لئے ہزاروں نے سر پٹخے' جھنجھلاہٹ کا اظہار کیا' اللہ بزرگ وبرتر نے صحائف بھیجے' کتابیں

اتاریں لیکن یہ عفریت بڑا ہی سخت جان ہے' کینچوے کی طرح ٹکڑے ٹکڑے کر دیجئے پھر بھی چلنے پھرنے لگے گا' خاک ہے پر خاک نہیں بنتا' یہ عفریت جب ہمارے دل میں بسیرا کر لیتا ہے تو اس کے وارے نیارے ہو جاتے ہیں' ہمارا ہی خون چوستا ہے اور ہمیں ہی کو نیست و نابود کرتا ہے۔ تعصّبات کی خوراک وہ دقیانوسی خیالات، مفروضے اور توہمات ہیں جن کا ٹھنڈے دل سے کبھی تجزیہ کیا ہی نہیں جاتا' تعصّبات کی سلطنت بڑی وسیع ہے' پوری دنیا یا شائد اور کتنی دنیائیں۔ یہ عفریت' ہمیں سچ بولنے' سچ ماننے' سچ کہنے کی صلاحیت سے محروم کر دیتا ہے۔ ہمیں سچ وہی لگنے لگتا ہے جو ہماری ذاتی خواہشات کو پورا کرتا ہو' ہمیں اپنی آنکھ کا شہتیر کبھی نظر نہیں آتا اور دوسروں کی آنکھ کا تنکا صاف صاف دکھائی دیتا ہے۔ جب ہم ست ہوں تو ہم آرام کر رہے ہیں یہ ہمارا حق ہے' جب کوئی اور ست ہو تو وہ لعنتی ہے' مشٹنڈا ہے' ٹکڑ خور ہے' اگر ہماری بہن سے زیادتی ہو رہی ہے تو قیامت ٹوٹ پڑتی ہے اور جب ہم کسی کی عزت لٹتے دیکھتے ہیں تو ہمارے کانوں پر جوں تک نہیں رینگتی' اگر ہماری بیٹی بیوہ ہو گئی ہے تو ہم خون کے آنسو بہاتے ہیں' اگر کسی اور کی بیٹی بیوہ ہو گئی ہے تو وہ ڈائن ہے' کم بخت ہے' تعصّبات کے پھیلانے میں ہمارے ذاتی مفادات کا بڑا حصہ ہے' مجھے ایک روز کچھ خواتین سے گفتگو کرنے کا موقع ملا' گفتگو سوتیلی ماں پر ہو رہی تھی' کسی نے کہا' بڑی ظالم ہوتی ہے' یہ اپنے شوہر کے بچوں کو جن مشکلات سے دوچار کرتی ہے ان کی فہرست بڑی طویل ہے' کسی نے کہا اللہ تعالیٰ کسی کو سوتیلی ماں کی آزمائش میں نہ ڈالے' نری قہر ہوتی ہے یہ' ہمیں یاد ہے کہ بچپن میں ہماری امی ایک کہانی سنایا کرتی تھیں جس میں ایک سوتیلی ماں کا ذکر تھا جو اپنی سوتیلی بیٹی کو آٹے کی نہیں بلکہ چھان کی روٹی دیا کرتی تھی اور ہر ستم روا رکھتی تھی' ہمیں یہ کہانی بہت اچھی لگتی تھی۔

ایک برصغیر کے ادب پر ہی کیا موقوف' یورپ کے کہانی کاروں نے بھی کئی ایک ایسی اور جانے کتنی کہانیاں رقم کی ہیں۔ یہ کوئی 20 سے 25 سال پہلے کی بات ہے کہ مجھے ایف اے کے طلباء کو ابراہم لنکن کے بارے میں ایک مضمون پڑھانا پڑا جو ان کے نصاب میں شامل کیا گیا

تھا اور ابھی تک شامل ہے۔ ابراہم لنکن کے باپ نے دوسری شادی کر لی' ابراہم چھوٹا سا تھا' نئی ماں بہت سے بچے ساتھ لیکر آئی تھی اس نے ابراہم کا اتنا خیال رکھا کہ اس کی زندگی مین بہار آ گئی' سوتیلی ماں کی یہ کہانی پہلی مثبت کہانی تھی جس کو مجھے پڑھنے کا اتفاق ہوا تھا اور میں یہ سوچنے پر مجبور ہو گیا تھا کہ انسان' انسان ہوتا ہے نہ شیطان' نہ فرشتہ۔ عورت' عورت ہوتی ہے اگر وہ ایک اچھی خاتون ہے تو اسے اپنے ان بچوں سے بھی اتنا ہی پیار ہو گا جو اس کے شوہر کے ہیں' انگریزی کا ایک قول ہے ''Love me and love my dog'' یعنی اگر تمہیں مجھ سے محبت ہے تو میرے کتے سے بھی محبت کرو' محبت تو پھر محبت ہوتی ہے اگر کسی سے ہو جائے تو پھر اس کی اولاد تو کیا اس کے جانوروں' اس کی اشیاء اور اس کی پوری کائنات سے محبت ہو جاتی ہے۔ دراصل سوتیلی ماں کے جور و جبر کی کہانیاں خواتین نے سوت کے نفرت انگیز تصور کی آڑ میں گھڑی ہیں اور اپنے تحفظ کے لئے گھڑی ہیں' سوتیلی ماں سے نفرت ہو گی تو اولاد کبھی باپ کو دوسری شادی نہیں کرنے دے گی اور پھر باپ بھی یہ سوچنے پر مجبور ہو جائے گا کہ کہیں اس کے بچے مصیبتوں کا شکار نہ ہو جائیں' ہماری رائے میں کوئی ماں سگی یا سوتیلی نہیں ہوتی' نفرتیں اس طرح کے افسانے تراشتی ہیں۔ فرض کیجیئے ایک نوجوان لڑکی بیوہ ہو گئی ہے۔ اسے اپنانے کے لئے کوئی بھی تیار نہیں صرف اس تعصب کی بنیاد پر کہ وہ بیوی بن کر شوہر کے بچوں سے اچھا سلوک نہیں کرے گی، اسے بے سہارا چھوڑ دیا جائے تو یہ کون سی معاشرتی خدمت ہو گی۔ اسی طرح اگر کوئی شوہر اپنی رفیقۂ حیات کو کھو بیٹھتا ہے تو وہ اس خیال سے دوسری شادی نہ کرے کہ اس کے بچے ابتلاء و آزمائش میں پھنس جائیں گے' درست نہیں ہو گا' کیونکہ اگر وہ ایسا نہیں بھی کرتا تو اس کے بچے جانے کس کس آزمائش سے دوچار ہو سکتے ہیں' مسئلہ سگا اور سوتیلا ہونے کا نہیں' مسئلہ انسان ہونے کا ہے۔ ہم نے ایسے باپ دیکھے ہیں جو اپنی اولاد کے لئے جانے کس کس پریشانی کا باعث بنتے ہیں' اور ایسی مائیں دیکھی ہیں جنہوں نے اپنی اولاد کو کبھی اولاد ہی نہیں سمجھا' اگر معاشرتی حوالوں سے اپنی ماں قیامت بھی توڑ دے تو وہ ماں ہے اور سوتیلی یا سوتیلا

باپ اگر ذرا سا انتباہ بھی کر دے تو وہ قیامت سے کم نہیں' یہ صورت حال دراصل اس تعصب سے پیدا ہوئی ہے جس کی صدیوں سے خود غرضانہ مقاصد آبیاری کرتے رہے ہیں' ہمارے تجربے میں ایسی ماؤں اور ایسی بیواؤں کی کمی نہیں جنہیں دنیا سوتیلا سمجھتی ہے لیکن وہ پیار کی ایسی مشعل ہیں جو زندگی کو بقعۂ نور بنا دیتی ہیں۔ سراپا محبت' سراپا پیار۔ ہماری رائے میں بچہ' سب کا بچہ ہوتا ہے' بچے کی پرورش زندگی کی پرورش ہے اگر کوئی مرد اپنی بیوی کے بچوں کو اپنا نہیں سمجھتا اور اگر کوئی عورت اپنے شوہر کے بچوں سے نفرت کرتی ہے تو اس طرح کے مرد و زن دراصل ذہنی عارضے کا شکار ہوتے ہیں' اخلاقی گراوٹ کے پروردہ ہوتے ہیں' انہیں ایک دوسرے سے محبت نہیں ہوتی' وہ تو ایک دوسرے کو اپنے تعصّبات اور اپنے خود غرضانہ مقاصد کی تکمیل کا ذریعہ سمجھتے ہیں۔

ضرورت اس امر کی ہے کہ تعصّبات کی ان آندھیوں کا نوٹس لیا جائے جو زندگی کی ہری بھری کھیتیوں کو نیست و نابود کر دیتی ہیں' ان بجلیوں کو پنپنے نہ دیا جائے جو خرمن حیات کو خاکستر بنا دیتی ہیں' انسانیت کا یہ گورستان بڑا ہی بھیانک گورستان ہے' اس طرح کے جانے کتنے گورستان ہیں کتنے قبرستان ہیں۔ جوں جوں انسان مہذب ہوگا' سچ مچ مہذب انسان! تو وہ ایسے قبرستانوں کو صفحۂ ہستی سے مٹا دے گا اور پھر محبتوں کی وہ ہوائیں چلیں گی جس سے کشت حیات میں بہاریں آ جائیں گی' شاخ زندگی میں وہ پھول کھلیں گے جو پورے ماحول کو معطر کر دیں گے' ایسا سبزہ پھوٹے گا کہ ہر طرف ہریالی ہی ہریالی ہوگی۔ صحرا سمٹ جائیں گے اور شہر آباد ہوں گے' انسانوں کے شہر۔

سرگودھا میرا شہر

جذبے عجب منہ زور، بے لگام اور بے زمام ہوتے ہیں، جانے کیا کیا کچھ کرنے پر مجبور کر دیتے ہیں، ان کے مزاج کا کچھ بھی پتہ نہیں چلتا، دل آئے تو پتھروں کو پوجنے پر مجبور کر دیتے ہیں، خیالی جہانوں کی تعمیر کا کچھ ایسا احساس پیدا کرتے ہیں کہ انسان خشت و سنگ ہی اکٹھے کرتا رہ جاتا ہے، لیکن ان منہ زور جذبوں کا ایک حریف وقت ہے جو انہیں نگل لیتا ہے، انہیں ختم کر دیتا ہے اور پھر ان کی جگہ نئی آرزوئیں، نئے ارادے، نئے نصب العین تخلیق کرتا ہے۔ یہ وقت ہی ہے جو ناممکن کو ممکن اور ممکن کو ناممکن بنا دیتا ہے۔ وقت کچھ ایسے چرکے لگاتا ہے کہ جو جان لیوا لگتے ہیں اور پھر انہیں کچھ اس طرح مندمل کر دیتا ہے جیسے کبھی لگے ہی نہ ہوں، عجیب قوت ہے، عجیب توانائی۔

میری زندگی میں بھی وقت نے جانے کیا کیا گل کھلائے حسین و دل آویز گل! اور جانے کیا کیا ستم ڈھائے، جان لیوا، جان کا روگ ستم، ایسے لمحے زندگی میں آئے جو دائمی لگے اور پھر جانے کہاں کھو گئے۔ کچھ ایسے لمحے میری زندگی میں پچاس کی دہائی کے اواخر میں آئے، جب میں لاہور میں نابینا افراد کے ادارے میں زیر تعلیم تھا، ایک وقت تھا کہ ادارے میں ایک پل ٹھہرنے کو جی نہیں چاہتا تھا اور ایک وقت آیا جب یہ ادارہ زندگی لگنے لگا۔ ایسا محسوس ہونے لگا کہ اس کے سوا کہیں کوئی جہان آباد ہی نہیں۔ ساتوں آسمان یہیں موجود ہیں، ساری دھرتی اسی میں سکڑ گئی ہے، میری عمر کوئی چودہ پندرہ سال ہوئی تھی لیکن سچ پوچھیئے تو مجھے اس احساس نے بڑا تڑپایا تھا کہ مجھے اس ادارے سے بہر حال چلے جانا ہوگا۔ کتنے اچھے دوست تھے وہاں، کتنے شفیق استاد، کتنی عمدہ فضائیں اور کتنے شیریں مناظر لیکن پھر سب کچھ چھٹ گیا۔ میں خوشاب لوٹ آیا

جہاں سے میں وہاں گیا تھا۔ جب گیا تھا تو خوشاب اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا لیکن یہ آنکھیں کم سنی کی آنکھیں تھیں، بھولنہار، بے پرواہ آنکھیں، کوئی جلوہ بھی تو نہیں سمیٹا تھا، ہاں کچھ گلیاں کچھ بازار کچھ گھر ذہن میں محفوظ ہو گئے تھے جو ابھی تک محفوظ ہیں اور خوابوں کی دنیا آباد کرتے ہیں لیکن جب لاہور سے واپس لوٹا تو آنکھیں ساتھ چھوڑ چکی تھیں، آنکھوں کی جگہ احساس نے لے لی تھی اور احساس بھی حصول منزل کا احساس تھا یہ احساس کہ کچھ پڑھنا لکھنا ہے تبھی زندگی کا کارزواں آگے بڑھے گا۔ اس عمر میں یہ احساس کم ہی پیدا ہوتا ہے لیکن میرے حصے میں یہ احساس کچھ زیادہ ہی آ گیا تھا، بس اسی احساس نے وہ دواڑھائی سال ہضم کر لئے جو خوشاب میں گزرے، خوشاب دل میں اپنی جگہ بنا چکا تھا لیکن دل ہی کے ہاتھوں دماغ کی معیت میں وہاں سے کوچ کیا اور سرگودھا کو اپنے جذب وفکر کا محور بنا لیا۔ یہ کوئی ستمبر 1963ء کی بات ہے جب میں اور میرے تمام گھر والے سرگودھا منتقل ہو گئے، سیٹلائٹ ٹاؤن سرگودھا جسے اب اولڈ سیٹلائٹ ٹاؤن کہتے ہیں۔ سیٹلائٹ ٹاؤن کہاں تھا ایک دنیا تھی جس میں رہ کر مجھ پر زندگی کے نئے رنگ وروپ ظاہر ہوئے۔ میں نے حصول علم کے ساتھ ساتھ نابینا حضرات کی فوز وفلاح کے تصور کو بھی عملی شکل دینا شروع کر دی تھی۔ سرگودھا سے میں نے بی۔اے کیا اس دور کا گورنمنٹ کالج سرگودھا بھی عجیب وغریب کالج تھا کیونکہ اس میں میری زندگی کے دن کچھ اس طرح گزر رہے تھے کہ ہر دن کوئی نہ کوئی خواہش لے کر طلوع ہوتا تھا۔ کوئی کتاب پڑھنے کی خواہش، اچھے نمبر لینے کی خواہش، کسی تقریب میں حصہ لینے کی خواہش، میرا شعور، اپنا اصلی رنگ و آہنگ حاصل کرنے کی کوشش میں محو تھا۔ پھر دو سال کے لئے فیصل آباد جانا پڑا، ایم۔اے انگریزی کرنے کے لئے۔ ایم۔اے انگریزی کرنے کے اس تجربے نے مجھے جو کچھ دیا اسے سرگودھا کے قدموں میں ڈھیر کرنے کے لئے ہم سب پھر سرگودھا آ گئے۔

اس زمانے کا سرگودھا سیدھا سادھا تھا، ویسے اب بھی اس میں کوئی خاص کجی نہیں آئی، لیکن اس دور کا سرگودھا لگتا بڑا سیدھا سادھا تھا، جانے کیوں مجھے ادبی سرگرمیوں میں حصہ لینے

کی بڑی خواہش نہیں ہوئی تھی اس لئے میں بہت دیر تک شہر کی ادبی تحریکوں سے الگ تھلگ رہا۔ تاہم کالج میں انگریزی ادب کے استاد کی حیثیت سے ENGLISH LITERARY CIRCLE کے تحت جو کچھ بن پڑا کیا اور پھر سرگودھا کی ادبی سرگرمیوں میں حصہ لینے کی خواہش پیدا ہوئی اور اس کی خوب خوب تسکین کی ۔ میں جو کچھ ہوں' میرے افکار جیسے ہیں' جذبات کی جو شکل ہے' یہ بڑی حد تک اسی شہر کی دین ہے۔ یہ الگ بات کہ خیالوں میں جذبوں کا کوئی خاص شہر نہیں ہوتا' وہ ایک شہر میں رہ کر دوسرے شہروں کی سیر و سیاحت بھی کرتے رہتے ہیں۔

اب جب کہ میں نے فیصلہ کرلیا ہے کہ مجھے اپنی سرگرمیوں کی آماجگاہ لاہور کو بنانا ہے ۔ سرگودھا کی محبتوں' چاہتوں اور رعنائیوں کا ذکر از خود لبوں پر آ رہا ہے۔ لاہور جانے کا ارادہ کسی مادی جذبے کے تحت نہیں کیونکہ میری مادی ضروریات میری خواہشات سے بھی زیادہ یہاں پوری ہو رہی ہیں۔ انسان صرف مادی نہیں وہ روحانی بھی ہے اور میری روحانی تسکین کا جو سامان سرگودھا مجھے فراہم کرتا رہا ہے ان کا بھی کوئی حد و شمار نہیں' مجھے ڈھیر ڈھیر محبتیں' بے حد و حساب خلوص ملا ہے' لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ سرگودھا کوئی خیالی جنت ہے۔ سرگودھا میرے لئے ایک حقیقت ہے' شیریں بھی، تلخ بھی ۔ جہاں مجھے تلخیاں ملیں' ایسی تلخیاں جو جان لیوا بھی ہو سکتی تھیں وہاں مجھے ایسی محبتیں بھی ملیں جنہوں نے مجھے بچا لیا۔ زندگی یہی ہے اور میں نے سرگودھا میں بھرپور زندگی گزاری ہے۔ طلباء اور طالبات اور بالخصوص طالبات نے مجھے وہ سب کچھ دیا جو بھرپور زندگی کے لئے ضروری ہوتا ہے۔ محبت' خلوص' تکریم' احترام اور جانے کیا کیا کچھ۔۔۔ کبھی یوں لگتا ہے کہ ایسے شہر سے دور چلے جانا کفرانِ نعمت ہے لیکن یہ حقیقت کہ زندگی میں آگے بڑھنے کے لئے کسی ایک جگہ ٹھہر جانا کوئی مثبت رویہ نہیں' اس ترقی یافتہ دور میں سرگودھا اور لاہور ایک ہی شہر محسوس ہوتے ہیں' برق رفتار گاڑیاں اور ٹیلی کمیونیکیشن نے یہ معجزہ سچ مچ سرانجام دے دیا ہے اس لئے میں لاہور میں ہوتے ہوئے بھی سرگودھا ہی میں ہوں گا اور خواہش ہے کہ اس

شہر کو جس نے مجھے وہ سب کچھ دیا ہے جس کی میں خواہش کر سکتا تھا بلکہ میری خواہشات سے بھی زیادہ وہ سب دیتا رہوں جو انسانی طور پر ممکن ہے' ایک بڑے شہر کی تمام سہولتیں' تمام اثر و رسوخ تمام روشنیاں اس کے ہاتھ میں تھما دوں' وہ لوگ جو سرگودھا میں نہیں' سرگودھا کے لئے اتنی توانائی اور قوت کا باعث ہیں کہ کبھی کبھی یوں محسوس ہوتا ہے کہ اگر وہ یہیں ہوتے تو اس قدر قوت اور توانائی کا باعث نہ بن سکتے۔ سرگودھا میرے گرتے، پڑھتے' ڈگمگاتے، ہنستے اور روتے لمحوں کا شہر ہے اور یہ سب لمحے میرے شعور' تحت الشعور اور لاشعور کا حصہ ہیں بلکہ ان کی حرارت سے ہی میری رگوں میں خون رواں دواں ہے اور اس میں کچھ کرنے اور کچھ کر گزرنے کی خواہش موجود ہے۔ وقت جس نے مجھے مختلف مقاصد سے روشناس کیا' مجھ میں متنوع جذبے تخلیق کئے، اب مجھ سے یہ تقاضا کر رہا ہے کہ میں اپنے عہد و پیمان کو نبھاؤں اور اپنے ارادوں اور آرزوؤں کے لئے اپنا دائرہ عمل کشادہ تر کردوں اپنی کوششوں کا محور سرگودھا کو ہی نہیں بلکہ پورے پنجاب اور پورے پاکستان کو بناؤں اور ایسا ممکن اسی وقت ہو سکتا ہے کہ جب مجھے وہ سہولیات فراہم ہوں جو ان مقاصد کی تکمیل کر سکیں اور یہ سہولیات جتنی زیادہ لاہور میں دستیاب ہیں شائد سرگودھا میں نہیں بلکہ یقیناً نہیں۔ اس لئے میرا یہ فیصلہ کہ مجھے سرگودھا کے ساتھ ساتھ لاہور کو بھی اپنی رہائش گاہ بنانا چاہیے شائد درست ہے۔ ویسے کون جانتا ہے کہ کیا ہو سکتا ہے' ہم تو صرف ارادے کر سکتے ہیں' ارادے کرنا مستحسن عمل ہے۔ ارادوں کی تکمیل اس کے ہاتھ میں ہے جس نے ارادے تخلیق کرنے والا دل و دماغ ہمیں دیا۔ وہ ذات بے ہمتا جس کے جلوے تاحدِ نظر بکھرے پڑے ہیں۔ جس کی نعمتوں کا کوئی شمار نہیں' جو خلوص کو پروان چڑھاتی ہے اور ارادوں کو پورا کرتی ہے۔ وہ ذات' وہ سب سے بڑی ذات اللہ تعالیٰ کی ذات ہے جس نے مجھے اندھیروں میں اجالے دیئے اور اجالوں کو روشن تر کیا۔ وہ ذات اب بھی مدد و معاون ہے مجھے اتنا یقین ہے اور اس یقین پر میں اپنی آرزوؤں' ارادوں کی دنیا تعمیر کر رہا ہوں۔ Ulyssis کی طرح جو اس وقت بھی عزم سفر کرتا ہے جب لوگ ستانے کے لئے اپنی زندگی کو وقف کر دیتے ہیں۔

کہتے ہیں جس کو عشق، خلل ہے دماغ کا

حسن کی شمع کے پروانوں، عشق کے متوالوں دل و جان قربان کر دینے والے جیالوں، علمِ وفا بلند کرنے والوں اور بلند بانگ نعرے بلند کرنے والے زندہ دلان سے معذرت کے ساتھ (لیکن ہم کیوں معذرت کریں) خیال تو یہ خود ایک عشق و محبت کے متوالے کا ہے۔۔۔۔جانے عشق و محبت کا وہ کونسا لمحہ تھا جب اس نے عشق کو دماغ کا خلل کہہ دیا تھا۔ شائد دکھی ہو کر کہا ہو، جھنجھلاہٹ سے کہا ہو یا یونہی کہہ دیا ہو کہ شعر کہنے کے لئے تصوف کی طرح عشق بھی گراں بہا خدمت سرانجام دیتا ہے۔ عشق کی کوکھ میں جنم لینے والے شعر جس انداز سے روح کو متحرک کرتے ہیں اور دلوں میں آگ لگا دیتے ہیں، اس کی مثال نہیں ملتی، عشق و محبت سے سرشار اشعار اور افسانے بلا کی قوت رکھتے ہیں اور اگر آپ ان سے کوئی مالی منفعت اٹھانا چاہیں تو کیا کہنے، کتنے ڈائجسٹ ہیں، کتنے ناول اور کتنے افسانے، جو دھڑا دھڑ بکتے ہیں، پڑھے جاتے اور پھر پڑھنے والے، سر کچھ اس انداز سے دھنتے ہیں کہ انہیں کچھ اپنی خبر اور نہ کسی اور کی خبر رہتی ہے، ساحر کو کچھ قلق تھا اور اس نے بڑے دکھ بھرے انداز میں لکھا تھا۔

میں نے جو گیت ترے پیار کی خاطر لکھے
آج انہی گیتوں کو بازار میں لے آیا ہوں
آج دکان پہ نیلام اٹھے گا ان کا
آج چاندی کے ترازو میں تلے گی ہر چیز

لیکن ہماری کاروباری دنیا سے متعلق شاعر اور ادیب خوب خوب اپنی دکانیں سجاتے ہیں، درد بھرے شعر لکھتے ہیں اور دردناک افسانے تحریر کرتے ہیں، شاید اس لئے نہیں کہ یہ ان کی

روح کی پکار اور دل کی آواز ہوتے ہیں' بلکہ اس طرح ان کی جھولیاں مال و منال سے بھر جاتی ہیں اور پھر وہ بھی دو چار دن کے لئے زندگی سے لطف اندوز ہو لیتے ہیں' آخر ان کا بھی تو حق ہے ،زندگی کو کچھا نہیں بھی تو دینا چاہیے اور اگر زندگی بے پرواہ اور بے نیاز ہے تو انہیں بڑھ کر جام تھام لینے کی کوئی نہ کوئی کوشش تو کرنی ہی چاہیے' اگر عشق و محبت سے سرشار افسانے اور اشعار لکھ کر لکشمی دیوی ان کے گھر کا طواف کرنے لگتی ہے تو پھر مضائقہ ہی کیا ہے۔ فارمولا فلموں کی طرح فارمولا افسانے اور اشعار بھی قبولیت عام کی سند حاصل کرتے رہے ہیں اور شائد کرتے رہیں گے۔ کچھ تو عشق خود ہی مائل بہ جنوں ہوتا ہے' ادباء اور شعراء اپنے پر ہمہ وقت طاری رکھتے ہیں بلکہ گریبان تو گریبان قلب و جگر لخت لخت کرنے کا دعوی کرتے ہیں۔ بالخصوص ہمارے یہ شاعر' یہ ادیب جن کے اعصاب پر عورت سوار ہوتی ہے جلتی پر تیل کا کام کرتے ہیں ' حسن کی وہ تصویریں پیش کرتے ہیں کہ بڑے بڑے زاہدوں اور مومنوں کا ایمان خطرے میں پڑ جاتا ہے اور مومن دل کافر ہونے لگتا ہے' آنکھیں بند ہو جاتی ہیں' دماغ خراٹے لینے لگتا ہے اور دل تھیا تھیا کرنے لگتا ہے۔ محبوب شئے اتنی دلآویز نظر آتی ہے کہ دیوانہ وار دل و دماغ شعروں میں لب و رخسار تلاش کر کے چوم چوم اٹھتے ہیں' جھوم جھوم اٹھتے ہیں اور پھر ایسی حسینہ کی تلاش میں سکون کو، آرام کو خیر باد کہہ کر جنگلوں اور صحراؤں میں نکل جاتے ہیں اور کبھی کبھی جب کچھ ہاتھ نہیں لگتا تو انہیں ہر نسوانی پیکر' افسانوں اور غزلوں کا حسن لئے دکھائی دیتا ہے۔ اور پھر تانک جھانک کا وہ سلسلہ شروع ہوتا ہے کہ الامان والحفیظ اور شاعر کی یہ نصیحت بارِ خاطر نظر آتی ہے۔

؎ دیکھنا بھی تو انہیں دور سے دیکھا کرنا
شیوۂ عشق نہیں حسن کو رسوا کرنا

لیکن وہ عشق ہے کہاں' وہ محبت کس شاخ پر کھلتی ہے' وہ خلوص کہاں دستیاب ہے جو

چھپ چھپ کر روتا ہے اور سرانجمن ہنستا ہے' آرام سے جل جاتا ہے' کبھی لب تک نہیں ہلاتا' جس کا ہوتا ہے اسی کا ہو جاتا ہے' ایک کیا جانے کتنی زندگیاں نچھاور کر دیتا ہے۔ ہم نے اس عشق کے قصے مستند کتابوں میں بھی پڑھے ہیں اور مستند اشخاص سے بھی سنے ہیں اور کبھی کبھی ان دل جلوں سے ملاقات کا شرف بھی حاصل ہوا ہے۔ جن کا دلوں کے ساتھ ساتھ جگر بھی جل جاتا ہے' سب کچھ راکھ کا ڈھیر ہو جاتا ہے اور پھر بھی اگر کچھ باقی رہتا ہے تو محبوب کی محبت۔ کبھی تو یہ سب کچھ افسانہ نظر آیا کرتا تھا' جھوٹ لگتا تھا' سراب محسوس ہوتا تھا' لیکن پھر ایسا وقت آیا کہ یہ سب کچھ سچ لگنے لگا' بہت بڑا سچ' ایسا سچ جسے باطل کہنا کفر ہے۔ ایسے ایسے واقعات سے روح نبرد آزما ہوئی کہ اعتبار آنے لگا۔ یقین ہونے لگا اور ہم فرائیڈ کو کوسنے لگے۔ کیا بد ذوق انسان تھا؟ وہ سرے سے محبت کو ہی نہیں مانتا تھا' اسے جنس اور ہوس سے تعبیر کرتا تھا۔ تھا جو مغرب کا بھلا، مغرب والوں کو عشق کا کیا پتہ' یہ تو سوغات ہے مشرق کی، جہاں نہال عشق خوب خوب اگتا ہے اور ثمر بار ہوتا ہے۔ ہم نے ایسے ایسے جملے سنے کہ وہ ہمیں الہام لگنے لگے۔ روح کے ایسے ایسے نغمے کہ جسم کھو کر رہ گیا لیکن زندگی کتنی ظالم اور سفاک ہے کتنے حسین خواب چھین لیتی ہے۔ کتنی دلآویز تصویریں مسخ کر دیتی ہے۔ یوں لگتا ہے کہ یہ سارے جملے' سارے الفاظ بس ایک وقتی جذبے کی پیداوار ہوتے ہیں اور کبھی کبھی یوں لگنے لگتا ہے کہ کہیں فرائیڈ سچ تو نہیں کہتا تھا، خدا نہ کرے وہ سچ کہتا ہو' خدا نہ کرے کہ ہمیں بالکل یقین آنے لگے۔ اگر ایسا ہو گیا تو خود ہمارے اشعار کا کیا بنے گا' ہمارے جذبے کیا کہلوائیں گے' اور پھر زندگی کتنی بے رونق' کتنی تنہا اور کتنی ویران ہو جائے گی، نہ غزلیں ہوں گی نہ گیت' نہ افسانے ہوں گے' نہ ناول' نہ کھڑکیاں کھلیں گی' نہ چھتیں آباد ہوں گی' لیکن ایسا لگتا ہے کہ زندگی یقین اور بے یقینی کے امتزاج سے ہی تعبیر پاتی ہے اور یہی زندگی کا حسن ہے' یہی اس کی رعنائی عشق دماغ کا خلل سہی مگر ہے تو عشق' کبھی کبھی اس سے دماغ میں خلل واقع ہو جائے تو کیا فرق پڑتا ہے۔ خلل تو جانے کن کن باتوں سے پڑتا ہے ہر طرف ایسے اسباب کی کمی نہیں جو دماغ میں خلل پیدا کرتے ہیں

اور کر سکتے ہیں۔ بس تو پھر کیا ہے، خلل پیدا کرنے کے لئے عشق کو بھی رہنے دیجئے، یہ لفظ ہی اتنا شیریں ہے، اتنا دلکش، اتنا دل فریب، میٹھا، جاں بخش کہ کفر کے لاکھ کلمات بھی اس کی شیرینی کم نہیں کر سکتے اور جب ایسا ہو تو اس خیال کو جھٹک دیجئے کیونکہ جینے کے لئے کچھ تو چاہیے، جینے کا کوئی سامان تو موجود ہو کہ اگر عشق کی ہما ہمی نہ رہی عشق کی گل کاریاں ختم ہو گئیں تو زندگی یکہ و تنہا رہ جائے گی، قہر بن جائے گی۔

وہ ایک جھوٹ سہی اعتبار کتنا تھا
دل و نظر کو میسر قرار کتنا تھا

خیال و خواب

غالبؔ نے کہا تھا۔

ہستی کے مت فریب میں آ جائیو اسدؔ
عالم تمام حلقۂ دامِ خیال ہے

حقیقت یہ ہے کہ حقیقت کچھ بھی نہیں، ہم اپنے تمام تر علم اور آگہی کے باوجود قطعیت سے کیا کچھ کہہ سکتے ہیں، ہمیں معلوم نہیں۔ یہ الگ بات کہ ہمیں کچھ خوابوں، خیالوں اور افسانوں کو حقیقت کہنا اور ماننا ہی پڑتا ہے۔ E.M.Forester نے اپنے ایک مضمون What I believe میں کہا تھا کہ عقائد بڑی سنگین شئے ہیں لیکن پھر بھی عقائد سے بچا نہیں جا سکتا، اشیاء پر یقین کرنا ہی پڑتا ہے، یہ تصور کہ ''I think therefore I am'' کتنا دلچسپ ہے۔ دراصل ہمارا ہونا ہمارے ہونے کا یقین ہے، بلھے شاہ نے بھی کہہ دیا تھا

کیہ جاناں میں کون بلھیا، کیہ جاناں میں کون

شکسپیئر کے ڈرامے King Lear کا ایک کردار جب انتہائی مشکل صورت حال میں ہوتا ہے تو کہہ اٹھتا ہے کہ ''کیا کوئی مجھے یہ بتائے گا کہ میں کون ہوں''؟ اور اس کا مسخرہ فقرہ چست کرتا ہے ''لیئر کا سایہ'' حالانکہ لیئر ایسا شہنشاہ رہا ہے جو کبھی شہنشاہیت کے خول سے نکل نہیں سکتا تھا، لیکن اس کی شہنشاہیت کی حقیقت کیا تھی یہ اسے اس وقت معلوم ہوا جب اسے طوفانِ باد و باراں سے نبرد آزما ہونا پڑا اور کہیں بہت مشکلات کے بعد اس پر کچھ کچھ حقیقت منکشف ہونے لگی لیکن اس وقت اس کی زندگی کے دن پورے ہو چکے تھے۔

صورتِ حال کتنی بھی گھناؤنی کیوں نہ ہو' مشکلات کتنی ہی جان لیوا کیوں نہ ہوں' زندگی سے سمجھوتا کر کے ہی جینے کا اسلوب تراشا جا سکتا ہے ورنہ حقیقتوں کے ہاتھوں میں زہر کے پیالے ہمہ وقت تیار ہوتے ہیں۔ ہم کسی وقت بھی ایک جام پی کر زندگی کو الوداع کہہ سکتے ہیں۔ یہ تازہ ہوائیں' مسکراتے ہوئے پھول' چاندنی راتیں' چاند چہرے' چاند لفظ' کبھی کبھی کتنے جان لیوا ہو جاتے ہیں' کتنے تلخ اور ناقابل برداشت' کچھ لوگ گھٹنے ٹیک دیتے ہیں' جان سے ہاتھ دھو بیٹھتے ہیں' لیکن کچھ بہادر روحیں' جری ارادے' مستقل مزاج آرزوئیں' تلخ کو شیریں بنا ہی لیتے ہیں اور پھر زندگی کا سفر جاری ہو جاتا ہے۔ تلخیاں اپنی شدت کھو دیتی ہیں' جھلستی ہوئی دھوپ کی تمازت کم ہو جاتی ہے۔ لیکن ہوتا یوں ہے کہ ہم کبھی جاگتی آنکھوں سے اور کبھی سوتی آنکھوں سے خواب دیکھنے لگتے ہیں' کبھی کبھی یہ خواب بھیانک بھی ہوتے ہیں' لیکن اکثر و بیشتر شیریں ہوتے ہیں' ہمیں یقین سا ہونے لگتا ہے کہ اگر مشکل دن آ گئے ہیں تو آسان دن بھی آ ہی جائیں گے۔ شیلی نے کہا تھا۔

Oh! if winter comes can spring be far behind

سعدی نے اس صورت حال کو کچھ یوں شعری پیکر عطا کیا تھا

رسید مژدہ کہ ایامِ غم نہ خواہد ماند
چنیں نہ ماند چناں نیز ہم نہ خواہد ماند

اور شاید ہاں' شاید سچ یہی ہے یا تو ایامِ غم رہتے ہی نہیں یا پھر ایامِ غم ہمیں غمزدہ لگتے ہی نہیں' ہم اس قدر سخت جان ہو جاتے ہیں کہ سنگریزے برداشت کرتے کرتے پتھروں کی بارش میں بھی جینے کی سبیل نکال لیتے ہیں اور اگر ہمارا ایک پاؤں کٹ جائے تو کبھی کبھی کہہ دیتے ہیں کہ چلو ایک جوتا پہننا نہیں پڑے گا۔ کتنے دلچسپ ہیں ہم لوگ؟ کتنے صابر اور شاکر کہ بعض اوقات انتہائی مشکل کو بھی آسان بنا لیتے ہیں۔ لیکن ایسے لوگ ہیں کتنے؟ بہت ہی کم' انگلیوں پر

گنے جاسکتے ہیں' لیکن یہ مٹھی بھرلوگ اقوام کوجنم دیتے ہیں' ارادوں کی تشکیل کرتے ہیں' نت نئے خواب بنتے ہیں اور ہستی کے فریب میں آ کر بھی ہستی کی تعمیر میں لگے رہتے ہیں' یہ جانتے ہیں کہ سب کچھ سراب ہے' لیکن سراب کو بھی سینے سے لگا لیتے ہیں کہ بات تو مان لینے کی ہے' وفاداری اور استواری ہے۔

وفاداری بشرطِ استواری اصل ایماں ہے
مرے بت خانے میں تو کعبے میں گاڑو برہمن کو

ہم سب عقیدوں پر جیتے ہیں اور عقیدہ' یقین' خواب اور خیال ہی ہمیں زندگی عطا کرتے ہیں' ہم جسے اپنا کہہ لیں وہی ہمیں اپنی زندگی لگنے لگتا ہے' جو آنکھ میں آ بسے اسے دل وجان قرار دے دیتے ہیں' مرمٹنے کے لئے تیار ہو جاتے ہیں' Keats نے کہا تھا۔

What imagination seizes to be beautiful must be true

جسے تخیل حسین کہہ دے وہ سب سے بڑی حقیقت ہے' جس پہ دل آ جائے' جس کا دل ہو جائے پھر زندگی جائے تو جائے' اس کا دامن نہ چھوٹے' اس فریفتگی اور شیفتگی کا مرکز بھولے بھالے حسین چہرے ہی نہیں ہوتے بلکہ حسین خواب اور حسین ارادے بھی ہوتے ہیں' یہ حسین خواب کہ مجھے زندگی کو حسین تر بنانا ہے' کچھ سسکتی روحوں کو سکون دینا ہے' کچھ تڑپتے دلوں کو راحت پہنچانی ہے' بھی ایک خواب ہے جو پیغمبروں نے دیکھا تھا' مصلحین نے دیکھا تھا' قائدین نے دیکھا تھا' اور پھر اس خواب کے لئے اپنے شب و روز قربان کر دیئے' زندگیاں لٹا دیں' اپنی جان' جانِ آفرین کے حوالے کر دی' جس طرف نظر ڈالیئے' بالعموم زندگی سسکتی ہوئی' کراہتی ہوئی' چیختی ہوئی محسوس ہوتی ہے' کہیں معذوری ہے تو کہیں مجبوری ہے' کسی کا سہاگ لٹ گیا ہے تو کوئی یتیم ہے' کسی کی سماعت نہیں تو کسی کے پاس بصارت نہیں' کسی کے پاس سب کچھ ہے مگر کچھ بھی نہیں۔ ایسی صورت حال میں آنکھیں کچھ خواب سجا لیتی ہیں' ذہن کچھ

آرزوئیں سمیٹ لیتے ہیں، فکر کو عمل کی سوجھتی ہے اور عمل شاہراہِ زندگی پر گامزن ہو جاتا ہے۔

ممکن ہے بلکہ بہت ممکن ہے کہ درخت کاشت کرنے والا درخت کے سائے سے استفادہ نہ کر سکے۔ لیکن یہ کیا کم ہے کہ کچھ جھلستے سروں کو سایہ میسر آ سکتا ہے۔ یہ تصور، یہ خواب ہی تلخ کو شیریں بنا دیتا ہے اور مشکلوں کو آسان کر دیتا ہے۔ لیکن ہوتا کچھ یوں ہے کہ آنکھیں خواب دیکھتی ہیں، مگر بھوکا پیٹ خوابوں کو نگل جاتا ہے۔ ذاتی اغراض کی خاطر شاخِ زندگی پر خلوص کے پھولوں کو چٹخنے ہی نہیں دیا جاتا، ذاتی منفعتوں کا اژدھا دوسروں کے دکھوں اور مصائب کے خواب وخیال کے اشجار کو پنپنے ہی نہیں دیتا۔ حل من مزید کا آسیب کتنے ہنستے، مسکراتے جہانوں کو خاکستر کر دیتا ہے، اپنا گھر بھرنے کی خواہش، پڑوسیوں کے گھروں کی اینٹ سے اینٹ بجا دیتی ہے اور یوں بہت سے اچھے خواب، دل نشیں خواہشیں دم توڑ دیتی ہیں۔ بچہ جب پڑھ رہا ہوتا ہے تو اس کے سامنے خدمتِ خلق کے کتنے در وا ہوتے ہیں لیکن پھر جب اس کی اپنی خودغرضیوں کا در وا ہوتا ہے تو خدمت خلق کے سارے دروازے مقفل ہو جاتے ہیں۔ میں ڈاکٹر بن کر دکھی انسانیت کی خدمت کروں گا۔۔۔۔ آپ کے پاس فیس ہے؟۔۔۔۔ آپ کا آپریشن لاکھوں روپے کا متقاضی ہے، میں کیا کر سکتا ہوں؟ میں علم حاصل کر کے جگہ جگہ علم کے چراغ روشن کروں گا، علم بڑی قیمتی شئے ہے اور قیمتی شئے کا حصول قیمت کے بغیر ممکن نہیں، یوں ننھی ننھی خواہشیں خودغرضانہ نقطۂ نظر کے سامنے دم توڑ دیتی ہیں۔

صورت حال کتنی ہی گھمبیر کیوں نہ ہو خواب وخیال کی دنیا آباد رہنی چاہیے، جس دن انسان خواب دیکھنا بند کر دے گا اس دن زندگی کی ضرورت باقی نہیں رہے گی اور یوم حشر برپا ہو جائے گا۔

دوست ہوتا نہیں ہر ہاتھ ملانے والا

''دوست'' کتنا پیارا لفظ ہوتا ہے' یہ کتنا جان پرور اور روح افزاء' ٹھنڈی ہوا کا جھونکا' جھلستی دھوپ میں ایک پارۂ ابر' دیارِ غیر میں گویا اپنا وجود' دوستی ایک رومان بھی ہے اور ایک حقیقت بھی۔ دوست کا نام آتے ہی گویا آسمانِ دل سے کشتِ وجود پر پھوار پڑنے لگتی ہے' سرسبز و شاداب کر دینے والی پھوار' کتنا بڑا سرمایہ ہوتا ہے۔ دوست ایک شجرِ سایہ دار ہے جو زندگی کی دھوپ سے محفوظ و مامون رکھتا ہے۔ اور بقول ذوقؔ۔

اے ذوقؔ کسی ہمدمِ دیرینہ کا ملنا
بہتر ہے ملاقات مسیحا و خضر سے

کوئی بچھڑا ہوا دوست اچانک مل جانے پر یوں لگنے لگتا ہے گویا ماضی لوٹ آیا ہو' بیتے لمحے پلٹ آئے ہوں' کتنا شیریں' کتنا دلکش ہوتا ہے یہ احساس! لیکن کہتے ہیں کہ ہمہ جہتی قحط کے اس دور میں دوستی بھی یادِ پارینہ بن کر رہ گئی ہے۔ اس سے یادِ محبوب کی طرح بس دل بہلاتے رہیے' دوستی کے گن گاتے رہیے' اصل دوست اگر زندگی میں ایک ہی مل جائے تو اس سے بڑی خوش قسمتی شائد کوئی اور نہ ہو کیونکہ دوستی کے نام پر انسانیت پر جو ظلم ڈھائے گئے ہیں اس سے دوستی کے تصور ہی سے روح کانپ اٹھتی ہے

دیکھا جو تیر کھا کے کمیں گاہ کی طرف
اپنے ہی دوستوں سے ملاقات ہو گئی

Julius Caesar کو جب اچانک سر جھکائے ہوئے درباریوں نے قتل کرنے

کے لئے حملہ آور ہونا چاہا اور زخم پر زخم لگائے لیکن جو زخم اس کے لئے جان لیوا ثابت ہوا وہ اس کے بہترین دوست Brutus کا لگایا ہوا تھا۔ Caesar کا آخری جملہ تھا'' Even you Brutus '' یوں جانے کتنے Caesar اور کتنے Brutus زندگی نے جنم دیئے ہیں لیکن اسکے باوجود دوستی کے بغیر زندگی کا تصور ناممکن ہے۔ E.M.Forester نے کہا تھا کہ وہ اپنے ملک کو تو دھوکا دے سکتا ہے لیکن اپنے دوست کو نہیں۔ ہو سکتا ہے کچھ محبانِ وطن کو Forester کی یہ بات اچھی نہ لگے لیکن ہمارے خیال میں جو زندگی میں کوئی دوست نہیں بنا سکتا وہ کسی اور شے سے بھی محبت نہیں کر سکتا' نہ ملک سے اور شائد نہ ہی خدا سے' یہ بات درست ہے کہ دوستوں کی تلاش میں کامیابی صرف اور صرف اتفاقیہ ہو سکتی ہے یہ ایک ایسی نعمت ہے جسے خدا کی نعمت ہی کہا جا سکتا ہے۔ جہاں محبوب راتوں کی نیند اچاٹ کر دیتا ہے، دن کا سکون لوٹ لیتا ہے' وہاں دوست کبھی تھپکیاں دے کر سلاتا ہے تو کبھی سکون اور راحت عطا کر کے کچھ کرنے کے قابل بناتا ہے۔ جہاں محبوب ایک کمزوری ہوتا ہے وہاں دوست طاقت کا سرچشمہ بنتا ہے۔ غالب نے کہا تھا۔

ے یہ کہاں کی دوستی ہے کہ بنے ہیں دوست ناصح
کوئی چارہ ساز ہوتا کوئی غمگسار ہوتا

دوست چارہ ساز اور غم گسار ہوتا ہے جب کہ محبوب ایک کڑی آزمائش اور ابتلا ہوتا ہے۔ ہم اتنے بدذوق بھی نہیں ہیں کہ محبت کے حسن سے واقف نہ ہوں' ہمارے سینے میں ابھی دل دھڑکتا ہے کیونکہ یہ دھڑکن زندگی کی علامت ہے جب تک دل دھڑکتا رہے گا کشتِ حیات پروان چڑھتی رہے گی لیکن ہماری رائے میں دوست ایک ایسی نعمت ہے جو کسی خوش بخت کو ہی حاصل ہوتی ہے۔ کسی نے کہا تھا کہ پہلی ملاقات اور بوس و کنار کے درمیان کا عرصہ دوستی کا عرصہ ہوتا ہے اور دراصل یہی وہ عرصہ ہوتا ہے جب آنکھیں دیکھتی ہیں اور کان سنتے ہیں اور وجود

احساس کی دولت سے مالا مال ہوتا ہے۔ اس طرح دوستی کا یہ عرصہ زندگی کا انتہائی دل پذیر عرصہ ہوتا ہے۔ ہمیں محبت کی لذتوں کا انکار نہیں لیکن ہم دوستی کی نعمتوں سے بھی واقف ہیں' جب دوست کہیں دور چلا جاتا ہے تو وہ بہت یاد آتا ہے مگر کاروانِ حیات جاری رہتا ہے لیکن جب محبوب داغِ مفارقت دے جاتا ہے تو گویا زندگی ہی داغِ مفارقت دے جاتی ہے۔ ہمارے خیال میں زندگی موت سے کہیں بہتر ہے۔ آپ حیرت زدہ ہوں گے بالخصوص وہ قارئین جو میری شاعری پڑھتے آئے ہیں کہ میں نے ہمیشہ محبت کے گن گائے ہیں' علمِ محبت بلند کیا ہے اور بارہا بازو تک کٹوا کر پرچم محبت کو گرنے نہیں دیا لیکن مجھے یہ بھی معلوم ہے کہ موت ناگزیر ہے تو زندگی بھی ضروری ہے' زندگی کے ساتھ ساتھ محبت بھی پروان چڑھتی رہنی چاہیے' مگر سب کچھ محبت پر تج دینا زندگی کے ساتھ انصاف نہیں' ہماری رائے میں دوست کے لئے ہم خیال ہونا ضروری نہیں اور نہ ہی خوش شکل ہونا' ہر وہ شخص آپ کا دوست ہے جو آپ کو بطور دوست قبول کرتا ہے اور پھر دوستی کے تقاضے سمجھتا ہے۔ شیکسپیئر کے ایک کردار Feste نے کہا تھا کہ میں اپنے دشمنوں کی وجہ سے شاد کام ہوں اور دوستوں کی وجہ سے ناشاد۔ دوست اپنی رطب اللسانی سے مجھے گمراہ کرتے ہیں اور دشمن اپنی تنقید سے مجھے آئینہ دکھاتے ہیں' ہمارے خیال میں اچھا دوست اتنی صلاحیت رکھتا ہے کہ وہ اپنے دوست کی کمزوریاں بیان کر سکے۔ وہ اپنے دوست کو بتا سکے کہ اس کا عمل کہاں تک درست ہے اور کہاں تک غلط۔ کم از کم وہ اپنا مافی الضمیر بے باکی سے بیان کر دے کیونکہ وہ اپنے دوست کو اپنی دانست کے مطابق کسی صورت مشکلات سے ہم آغوش ہوتے نہیں دیکھ سکتا۔ محبوب دل کی دھڑکن ہے اور دوست ضمیر کی آواز' محبوب آنکھ ہے مگر دوست قوتِ بینائی' محبوب گوش کی حیثیت رکھتا ہے اور دوست سماعت کی' یہ درست ہے کہ محبوب بینائی اور سماعت چھین سکتا ہے بلکہ چھین لیتا ہے جب کہ دوست طبیب ہوتا ہے اور راہنما ہوتا ہے۔ لیکن اس کے ساتھ ساتھ وہ ایک ہمدرد ہوتا ہے جو اپنے دوست کے درد میں شریک بھی ہوتا ہے۔ وہ ساحل سے ڈوبتے ہوئے دوست کو محض نصیحتیں نہیں کرتا بلکہ اس کو نکالنے کے لئے خود

بھی موجوں سے ہمکنار ہو جاتا ہے۔ دوست دن بھی ہے اور رات بھی' پھول بھی ہے اور کانٹا بھی' توصیف بھی ہے اور تنقید بھی' لیکن دوست ملتے کہاں ہیں؟ بکتے کہاں ہیں؟ شائد کہیں نہیں' بس کبھی کبھی کہیں سے آ کر اچانک ہاتھ تھام لیتے ہیں' یہ ہمارے ہمسفر ہوتے ہیں اور پھر ہمارے سفر کا جز و لاینفک بن جاتے ہیں' مگر ٹھہریئے' انسان کا سب سے بڑا دوست' قابل اعتماد دوست' کہیں قریب ہی ہوتا ہے' کہاں ہوتا ہے شائد مجھے معلوم ہے' شائد آپ کو بھی معلوم ہے' کان آگے بڑھایئے' سُنیے' انسان کا بہترین دوست خود انسان آپ ہوتا ہے' جو شخص خود اپنے آپ سے وفادار نہیں وہ نہ کسی سے وفادار ہو سکتا ہے اور نہ اسے کوئی وفادار دوست میسر آ سکتا ہے۔ یہ بات اپنے پلے باندھ لیجئے' یہ نسخہ کیمیا ہے جو زندگی کو تابناک تر بنا سکتا ہے۔

آرزو کے چراغ جلنے دو

غموں کے اندھیرے دکھوں کی تاریکیاں مسائل کی گھٹا ٹوپ راتیں محرومیوں اور ناکامیوں کی یورشیں سب کی سب زندگی کو تاریک تر بنانے پر ہمہ وقت محوکار دکھائی دیتی ہیں۔ ایسا لگتا ہے کہ شائد مسائل و مصائب ہی کے خمیر سے زندگی کی نمو ہوئی ہے۔ہم سب جانتے ہیں کہ زندگی کا آغاز جنت بے نظیر کے چھن جانے سے ہوا۔آدم اور حوا بڑے آرام سے اور انتہائی سکون سے شب و روز کاٹ رہے تھے کہ ان کے دل میں ایک آرزو نے انگڑائی لی۔کیا تھا جو انہیں میسر نہیں تھا بس انہیں ایک ''شجرِ ممنوعہ'' کی آرزو نہیں کرنی تھی' اس کے قریب نہیں جانا تھا لیکن یہی آرزو ان کے اعصاب پر سوار ہوگئی اور پھر وہی کچھ ہوا جو ہم سب کو معلوم ہے لیکن کچھ ایسا لگتا ہے کہ یہ ادا خالق کائنات کو اچھی لگی۔شائد یہ سب کچھ اس کی مشیت کا تقاضا تھا' فرشتوں کے انتباہ کے باوجود باری تعالیٰ جانتے تھے کہ مٹی کا یہ پُتلا بڑی کام کی چیز ہے اور غالباً کام کی چیز وہ آرزو تھی' جو اس میں آہستہ آہستہ روشن ہو رہی تھی، شعلہء جوالہ بن رہی تھی۔ایک جنت چھن گئی مگر علم و آگہی کی جانے کتنی جنتیں اس کے ہاتھ لگیں۔تقاضاء مشیت یہی تھا۔آرزو کی یہ قندیل' امید کا یہ دیا' خواہشوں کے یہ چاند اور ستارے' تمناؤں کے یہ روشن دن آہستہ آہستہ تمام اندھیروں کو نگل جاتے ہیں' اجالوں میں تبدیل کر دیتے ہیں' موت کو زندگی سے آشنا کر دیتے ہیں۔یہ آرزو نہ ہو تو انسان راکھ کا ڈھیر ہے، یہ زندگی ایک نہ ختم ہونے والی تاریک رات ہے' یہ تگ و تاز اور جدو جہد' بے مصرف اور بیکار ہے۔رات کو سحر کا انتظار ہوتا ہے' اپنی جان لٹا دیتی ہے مگر سحر کی آمد کا پیش خیمہ ضرور بنتی ہے۔ارشاد ربانی ہے' ''اللہ کی رحمت سے کبھی ناامید مت ہونا'' اس کی رحمت بڑی بڑی زحمتوں' بڑی بڑی کلفتوں کو نیست و نابود کر دیتی ہے۔سمندر میں ساحل

تراشتی ہے اور تنکے کو طوفانوں سے نبرد آزما ہونے کا حوصلہ عطا کرتی ہے۔ یہ کتنا بڑا سچ ہے کہ جسے جھٹلایا نہیں جا سکتا۔ شیلی نے کہا تھا

Oh,if winter comes

Can spring be far behind

شیخ سعدی نے کہا تھا۔

رسید مژدہ کہ ایامِ غم نہ خواہد ماند
چنیں نہ ماند چناں نیز ہم نہ خواہد ماند

Every cloud has a silver lining

رات طویل سہی کیا یہ کم ہے کہ آخر کار اس کی صبح ہونی ہے۔ زندگی کا انجام موت سہی مگر یہ حقیقت کتنی دل خوش کن ہے کہ موت ابدی زندگی پر منتج ہوگئی۔ امید راہ رو منزل کے قدموں میں قوت پیدا کرتی ہے' امید طالبعلم کو ہمہ وقت کتابوں کی دنیا میں کھوئے رہنے کا جذبہ عطا کرتی ہے' امید نابینائی کو بینائی عطا کرتی ہے' بہرے پن کو سماعت دیتی ہے' خاموشی کو نطق عطا کرتی ہے۔ اقبالؒ نے کہا تھا۔

کبک پا از شوخیء رفتار یافت
بلبل از سعیِ نوا منقار یافت

مجھ سے بھی ایک شعر ہو گیا تھا

ترے وجود کی نس نس سے آنکھ جھانکے گی
اگر ہے ذوقِ تماشا نظر کی بات نہ کر

ڈھونڈنے والوں کو نئی دنیا دینے کا یہی مطلب ہے' منزل کی خواہش رکھنے والوں کو

منزل مراد تک پہنچا دینے کا مفہوم یہی ہے۔ دراصل آرزو ہی زندگی ہے' آرزو ہی قوت اور طاقت ہے' امید اور آرزو کے بغیر زندگی کی تمام ہماہمی ختم ہو کر رہ جائے گی' آرزو ہی دل میں عشق کی جوت جگاتی ہے اور عاشق کو جنوں آشنا کرتی ہے' آرزو ہی مصور کو رنگ' شاعر کو الفاظ اور موسیقار کو سر کی تفہیم عطا کرتی ہے۔ خوبصورت بننے کی خواہش انسان کو خوبصورتی سے آشنا کر دیتی ہے۔ اسی آرزو نے پتھر کے دور کو بجلی کے دور میں تبدیل کر دیا' حرارت عطا کی اور مہ و مریخ کی دنیاؤں کو مسخر کرنے پر آمادہ کیا۔ آرزو کی موت زندگی کا اختتام ہے۔ Dickens کا کردار Micawber کہا کرتا تھا۔

''Something will turn up''

یقیناً کچھ نہ کچھ ضرور ہوتا ہے اور کچھ نہ کچھ ہونے کی توقع انسان میں حرارت بھر دیتی ہے اور قوت عطا کرتی ہے۔ آرزو کسی خیالی پلاؤ کا نام نہیں' دن میں خواب دیکھنے کی صورت نہیں' کسی شیخ چلی کی دنیا نہیں بلکہ آرزو تو ایک ایسی قوت ہے جو پورے وجود کو متحرک رکھتی ہے' پوری زندگی میں شعلے بھر دیتی ہے' لمحوں کو صدیاں عطا کرتی ہے اور صدیوں کو لمحوں میں تبدیل کر دیتی ہے۔ یہ ایک نیوکلیئر انرجی (Nuclear energy) ہے جو چھوٹی سے چھوٹی چیز کو قوتوں کا سرچشمہ بنا دیتی ہے۔ یہ کسی انسان کو ''میں'' عطا کرتی ہے تو کسی کو ''انا'' عطا کرتی ہے' خودشناسی اور خودآگہی کے جوہر تخلیق ہونے لگتے ہیں' نئی دنیائیں آباد ہونے لگتی ہیں۔

ہر لحظہ نیا طور نئی برقِ تجلی
اللہ کرے مرحلۂ شوق نہ ہو طے

یہ شوق کا سفر دراصل اثبات کا سفر ہے' زندگی کا سفر' روشنی کا سفر اور تحرک کا سفر ہے' اس سفر کو جاری و ساری رہنا چاہیے تاکہ تازہ بستیاں آباد ہو سکیں' نئی دنیائیں دریافت ہو سکیں اور ہر روز آرزو کا کولمبس ایک سفر پر روانہ ہو اور ایک نئی دنیا تلاش کرے۔

جو دلوں کو فتح کر لے وہی فاتح زمانہ

تہذیب وتمدن، سائنس اور ٹیکنالوجی، مادی آسائشیں اور سہولتیں ہمارے دور کا طرۂ امتیاز ہیں۔ ہمیں فخر ہے کہ ہم نے فلک بوس عمارتیں تعمیر کر لی ہیں، ہم پلک جھپکتے ہی جانے کہاں سے کہاں پہنچ جاتے ہیں۔ ہم نے حسن وزیبائی کے نت نئے ریکارڈ قائم کر لئے ہیں بلکہ مہ و مریخ کو اپنے پاؤں تلے روند دیا ہے، ہر شہر میں کالج اور یونیورسٹیاں ہیں، بڑے بڑے ہسپتال ہیں، بڑے بڑے بزنس پلازہ! لیکن شائد ہم کبھی یہ سوچ نہیں پائے کہ ہم نے اپنے جذبات، اپنے احساسات کا کتنا خون کیا ہے، باہمی رشتے اور محبتیں کس بری طرح پامال ہوئی ہیں، اخوت اور بھائی چارہ قصۂ پارینہ بن کر رہ گئے ہیں۔ رہا دل! تو اس کی کوئی سنتا ہی نہیں، ہاں جب دل کی دھڑکنیں تیز ہو جاتی ہیں تو قدرے فکر لاحق ہوتی ہے اور پھر ہم معلوم کرتے ہیں کہ خون کی گردش کس نہج پر ہے۔ جب کہیں کوئی دکھی دل چیختا ہے تو زندگی کے شوروغوغے میں اس کی آواز دب کر رہ جاتی ہے، کسی کے پاس فرصت کہاں کہ کوئی کسی کا حال پوچھے، کسی کی حکایت خوں چکاں سنے، کسی سے دریافت کرے کہ اس کی رات کیسے گزری، اس کا دن کیسے بیتا؟ ہاتھوں میں موبائل موجود ہیں، ایک نہیں دو دو، گھروں میں ٹیلی فونز کی بھرمار ہے مگر کوئی موبائل، کوئی ٹیلی فون دلوں سے منسلک نہیں۔۔۔۔ جذبوں سے تعلق نہیں رکھتا، احساسات کی لہروں کو محسوس نہیں کرتا، کوئی ایسا بیرومیٹر نہیں جو کہ دل کے موسم کی پیمائش کرے۔

یہ کتنا بڑا المیہ ہے، کتنی خوفناک صورت حال، کتنا دردناک منظر اور لطف کی بات یہ ہے کہ یہ کسی ایک کا مسئلہ نہیں، ہر ایک کے اپنے اپنے دکھ ہیں، اپنے اپنے درد، لیکن تہذیب و شائستگی کے تقاضے مجبور کرتے ہیں کہ اپنا درد، اپنا دکھ اپنی ذات تک محدود رہے، اگر کسی کو خبر ہو گئی تو یہ تہذیب و شائستگی کے اصولوں کی نفی ہو گی۔ چہرے پر مسکراہٹ سجا کر محفلوں کی جان بننا،

مسکراتے اور ہنستے ہوئے گفتگو کرنا' یہ تاثر دینا کہ آپ تو جنت ارضی میں مقیم ہیں' ہماری تہذیب کا اشاریہ بن گیا ہے۔ ذرا سا منہ بسور یئے ،دکھ کا اظہار کیجئے تو آپ سے خلعتِ شائستگی چھن جائے گی اور آپ کو مسند زندگی سے اٹھا کر بے پرواہی اور بے التفاتی کے سپرد کر دیا جائے گا' تو یوں ہنسنا ہنسانا ہی تہذیب و شائستگی کا سنہری اصول ٹھہرا۔ دل چاہے خون کے آنسو رو رہا ہو' آنکھوں میں سمندر جمع ہوں' جسم مضمحل ہو' امیدیں مرغ بسمل ہوں' چاہتیں سرد مہری کا شکار ہوں اور زندگی عذاب بن کر رہ گئی ہو مگر آپ کو ہنستے' مسکراتے نظر آنا چاہیے کہ ہنسی اور مسکراہٹ تہذیب و شائستگی کی سند ہے۔

ہنسو گے تو ساتھ ہنسے گی دنیا
بیٹھ اکیلے رونا ہو گا

لیکن کسی مذہب' کسی عقیدے' کسی مُصلح اور کسی پیامبر نے ایسا منشور حیات پیش نہیں کیا جس میں زندگی تصنع اور تکلف کا شکار ہو کر رہ جائے' دل کی دل میں رہے' لب پر نہ آئے۔

دینِ اسلام ہی کو لے لیجئے جس میں انسانیت کی معراج یہ ہے کہ معاشرے کے دکھوں کو کم کیا جائے' کسی کے آنسوؤں کو پونچھا جائے' کسی شکستہ دل کی تالیف کی جائے' تسکین بہم پہنچائی جائے' یہاں تک کہ تمام عبادات کا ماحاصل زندگی کے دکھوں کو کم کرنا ہے۔ اگر کسی ایک عضو میں درد ہو تو پوا جسم چیخ اٹھے' اگر ایک فرد مشکلات سے دوچار ہو تو پورے معاشرے کو اس کی فکر ہو لیکن جانے خالی خولی چمک دمک کہاں سے در آئی کہ انسانیت سسک رہی ہے مگر کسی کو خبر نہیں' ساتھ ساتھ بیٹھنے والے ہم پیالہ و ہم نوالہ تک کو یہ معلوم نہیں کہ دوسرے پر کیا بیت رہی ہے۔ جب کوئی درد بانٹنے والا نہیں ہوتا' دکھ کم کرنے والا نہیں ہوتا تو زندگی وبال بن جاتی ہے۔ ایک فرد اس وبال سے نجات پانے کے لئے خودکشی کا سہارا لیتا ہے اور اپنی زندگی ہی سے ہاتھ دھو بیٹھتا ہے۔ ماہرین نفسیات اور مصلحین پریشان ہیں کہ خودکشی میں اس قدر اضافہ کیوں ہو رہا ہے' کوئی اس کی وجہ کچھ بتاتا ہے اور کوئی کچھ لیکن بہت کم ہیں جو اس رائے کا اظہار کرتے

کر دی آئی ہے کہ کس کس انداز سے لفظ تماشا جا بجا اپنی جولانیِ طبع دکھاتا رہا ہے لیکن لفظوں کا بے دریغ اور بے محابہ استعمال جس گھناؤنے انداز سے ہمارے دور میں ہو رہا ہے اس کی مثال لفظیات کی تاریخ میں ڈھونڈنے سے بھی نہیں ملتی۔ اسی طرح کا ایک لفظ تماشا' عالمگیریت ہے' اگرچہ League of Nations اور UNO کے کارپردازان کو بھی یہ خبط رہا کہ وہ عالمگیریت کی ترویج کر رہے ہیں لیکن گزشتہ صدی کے اواخر سے اس خبط نے پر پرزے نکالے ہیں۔ اب عالمگیریت' Global Globalisation Village کے الفاظ زبان زدِ عام و خاص ہیں۔ ہر شخص عالمگیریت کی بات کرتا دکھائی دیتا ہے لیکن حقیقت یہ ہے کہ اس طرح کی اصطلاح کے استعمال کو Print اور Electronic میڈیا نے عام کیا ہے۔ Print اور Electronic میڈیا وہ جادو ہے جو سر چڑھ کے بولتا ہے۔ چنانچہ عالمگیریت کے لفظ کو اس قدر

ہوں کہ بقائے حیات کے لئے ہمیں اپنا اسلوب حیات تبدیل کرنا ہوگا۔ اول تو معاشی مشکلات سے نجات نہیں ملتی' اگر کبھی فرصت میسر آتی بھی ہے تو وہ کیبل نیٹ ورک پر نظر آنے والی چمکتی دمکتی دنیا کے حوالے ہو جاتی ہے۔ کوئی عزیز' کوئی رشتہ دار کتنی دور سے آیا ہو' آپ کی آنکھیں ٹی وی کی سکرین پر گڑھی ہیں ۔ بلکہ شائد مہمان بھی اسی سکرین کے حسن میں کھو کر رہ جاتا ہے۔ نہ میزبان کو یہ فکر ہے کہ وہ مہمان کے دکھ سکھ بانٹے اور نہ مہمان کو یہ جرأت کہ وہ لب کشائی کرے۔ ماں کے پاس فرصت نہیں کہ وہ بچوں کے مسائل کے لئے وقت نکال سکے' بچے ہیں کہ وڈیو گیمز میں محو ہیں، زندگی اور اس کے تقاضوں سے بے نیاز۔

شاعری' فلسفہ اور نفسیات جو زندگی کے دیرینہ ساتھی رہے ہیں' اپنا وقار کھو بیٹھے ہیں' کسے فرصت کہ وہ میر و غالب کو پڑھے' اقبال و فیض کا مطالعہ کرے۔ اگر ان کی کوئی غزل گائی بھی جا رہی ہو تو اسے سنا نہیں جا رہا' دیکھا جا رہا ہے' یوں ادب کے سوتے خشک ہوتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ رہا فلسفہ ! یہ تو گڑے مردے اکھاڑنے والی بات ہوئی نفسیات محض ذہن کا خلفشار ہے اور کچھ بھی نہیں لیکن اگر ایک پل کے لئے زندگی سے رابطہ ہو جائے' دلوں سے تعلق کی کوئی صورت نکل آئے تو آشکار ہوگا کہ ہم بہت دور نکل آئے ہیں' زندگی سے دور' خوشیوں سے دور ! ہمیں اپنے شاعروں' ادیبوں اور بزرگوں کی کوئی بات یاد نہیں' ہمیں یاد نہیں کہ زندگی کی اصل فتح دلوں کی فتح ہے' مذہبی رسوم و رواج کی اپنی اہمیت سہی لیکن ان کی روح دلوں تک رسائی ہے' دلوں کی حفاظت ہے' تسکین روح کا سامان بہم پہنچانا ہے اور راحت دل کی کوئی صورت نکالنا ہے کہ یہی عبادت' یہی دین اور یہی زندگی ہے۔

دل بدست آور کہ حجِ اکبر است
از ہزاراں کعبہ یک دل بہتر است

یا پھر یہ کہ

ڈھادے مسجد' ڈھادے مندر' ڈھادے جو کچھ ڈھیندا
اک بندیاں دا دل نہ ڈھاویں' ہر ارب دلاں وچ رہندا

عالمگیریت

یوں تو انسانیت آفرینش شعور سے ہی لفظوں کی بازی گری دیکھتی آئی ہے اور محسوس کرتی آئی ہے کہ کس کس انداز سے لفظ تماشا جابجا اپنی جولانیٔ طبع دکھاتا رہا ہے لیکن لفظوں کا بے دریغ اور بے محابہ استعمال جس گھناؤنے انداز سے ہمارے دور میں ہو رہا ہے اس کی مثال لفظیات کی تاریخ میں ڈھونڈنے سے بھی نہیں ملتی۔ اسی طرح کا ایک لفظ تماشا' عالمگیریت ہے' اگر چہ League of Nations اور UNO کے کارپردازان کو بھی یہ خبط رہا کہ وہ عالمگیریت کی ترویج کر رہے ہیں لیکن گزشتہ صدی کے اواخر سے اس خبط نے پر پرزے نکالے ہیں۔ اب عالمگیریت' Global Globalisation Village کے الفاظ زبان زدِ عام و خاص ہیں۔ ہر شخص عالمگیریت کی بات کرتا دکھائی دیتا ہے لیکن حقیقت یہ ہے کہ اس طرح کی اصطلاح کے استعمال کو Print اور Electronic میڈیا نے عام کیا ہے۔ Print اور Electronic میڈیا وہ جادو ہے جو سر چڑھ کے بولتا ہے۔ چنانچہ عالمگیریت کے لفظ کو اس قدر ہوا دی گئی ہے کہ ہر کس و ناکس اسے محسوس کرنے لگا ہے' بالکل اسی طرح جیسے کسی مکان میں جنوں بھوتوں کا بسیرا اس لئے تصور کر لیا جاتا ہے کہ اس گھر کو زبانِ خلق آسیب زدہ کہنے لگتی ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ تمام تر مادی ترقی کے باوجود حیرت انگیز مشینی سہولیات کے ہوتے ہوئے بھی فاصلے سکڑنے کی بجائے کچھ زیادہ ہی پھیل گئے ہیں۔ آپ چاہیں تو پل بھر میں ایشیاء سے یورپ پہنچ جائیں' امریکہ سے براعظم افریقہ کی سرحدیں چھونے لگیں لیکن شائد یہ ممکن نہ ہو کہ آپ اپنے پڑوسی کی چیخ سن کر آبدیدہ ہو جائیں' آپ کا دستِ اعانت اس کی طرف بے ساختہ بڑھنے لگے' اگر عالمگیریت ایک حقیقت ہے تو پھر انسانی اسٹیج پر یہ خونی ڈرامہ کیوں کھیلا جا رہا ہے' جس کی ایک جھلک سے چنگیز اور تیمور کی روحیں کانپ اٹھیں۔ ایسا کیوں ہے کہ مختلف

تہذیبیں آپس میں صف آراء اور دست بہ گریباں ہیں؟ معافی چاہتا ہوں دست بہ گریباں نہیں بلکہ ایک دوسرے کا گلا کاٹنے پر بلکہ نیست و نابود کرنے پر تلی ہوئی ہیں۔ ایسا کیوں ہے کہ پلک جھپکتے ہی شہر کے شہر نابود کر دیئے جاتے ہیں۔ آسمان سے بموں کی بارش' زمینی مخلوق کو پیوند خاک بلکہ جزو خاک کر دیتی ہے؟ ایسا کیوں ہے کہ انسانی ہاتھ ان فلک بوس عمارتوں تک پہنچنے لگے ہیں جہاں گوشت پوست کے انسان رہتے ہیں اور پل بھر میں ان کا نام ونشان تک مٹا دیتے ہیں؟ مشرق ہو یا مغرب' دونوں اللہ کے لئے ہیں' دونوں پر خلق خدا آباد ہے' دونوں کرّوں پر جیتے جاگتے' محسوس کرتے نفوس موجود ہیں' ان میں سے ہر ایک کو ذرا سی خراش سے بھی اتنا ہی دکھ پہنچتا ہے جتنا کسی اور ذی حیات کو۔ پھر ایسا کیوں ہے کہ ایک نہیں ہزاروں انسانوں کو پل بھر میں تباہ و برباد کر دیا جاتا ہے اور انسانی ضمیر کو احساس تک نہیں ہوتا۔ کسی نے اسے تجارتی مصلحتوں کے پیش نظر جائز قرار دے دیا ہے تو کسی نے مذہبی فریضہ تصور کر لیا ہے۔ سینکڑوں کی جان' جان آفریں کے سپرد کرنے کے لئے ایک جاندار اٹھتا ہے اور اپنی جان تج دیتا ہے کہ سینکڑوں لوگ عرصہ حیات سے نیست و نابود ہو جائیں۔

اسی عالمگیریت کے پس منظر میں ایک اور ڈرامہ بھی سٹیج ہو رہا ہے۔ دنیا کی دس فیصد آبادی زندگی کی تمام تر نعمتوں سے فیض یاب ہے' اس نے جنتِ ارضی آباد کر لی ہے' اس کے ایک اشارے پر زندگی کی ہر نعمت اس کے سامنے ڈھیر ہو جاتی ہے' سائنس کا دیو اس کے چراغ رگڑنے پر ''کیا حکم ہے میرے آقا'' کہہ اٹھتا ہے' آبادی کا یہ حصہ عالمگیریت کا نعرہ بلند کرتا ہوا دکھائی دیتا ہے۔ اس کے دامن میں سب کچھ ہے اس لئے وہ سمجھتا ہے کہ سب کچھ ٹھیک ہے۔ پل بھر کو بھی اسے یاد نہیں رہتا کہ اس عالمگیریت کے پردے میں زندگی کس طرح تڑپ رہی ہے' نیست و نابود ہو رہی ہے اور بقائے حیات کے لئے کیا کیا پاپڑ بیل رہی ہے۔ ایسے چولہوں کی تعداد ان گنت ہے جو اکثر و بیشتر گرم ہی نہیں ہو پاتے' ایسے بچوں کی کمی نہیں جو بھوکے' ننگے ایڑیاں رگڑ رگڑ کر جان دے دیتے ہیں' وہ لوگ بھی موجود ہیں جنہیں جہالت' بیماری اور غربت

کا عفریت ہمہ وقت نگلنے پر تیار ہے۔ جہاں سائنس کی نعمتیں محض کتابوں کی زینت ہیں' الفاظ ہیں اور جملے ہیں برق رفتاری سے چلنے والے جہاز موجود ہیں' لیکن وہ اب بھی گدھوں اور اونٹوں پر سفر کرتے ہیں۔ دنیا کے ایک کونے سے دوسرے کونے میں بات کرنے کی حیرت انگیز سہولتیں موجود ہیں لیکن وہ انتہائی ضرورت کے وقت PCO کے سامنے قطار در قطار کھڑے ہوتے ہیں۔ یہ خوفناک تفاوت' یہ روح فرسا امتیاز کس ڈھب کی عالمگیریت ہے؟ کس نوع کی اخوت' کس طرح کا بھائی چارہ ہے؟ عالمگیریت کا نعرہ بلند کرنے والے اس قدر بلند آوازوں سے چیخ رہے ہیں کہ ان کی چیخوں نے ان کی سماعت چھین لی ہے اور چیختی چلاتی انسانیت کی آواز ان تک نہیں پہنچ پاتی۔ ان کی آنکھیں تہذیب نو کی چکا چوند میں خاک وخون میں لتھڑی ہوئی زندگی کو دیکھنے سے قاصر ہیں۔ ان کا ٹی وی' ان کا ریڈیو' ان کا اخبار ''سب ٹھیک ہے'' کی نوید دیتا ہے اور اگر کبھی کبھی کوئی ناہمواری دکھائی دیتی بھی ہے تو اس کے اظہار سے خوفزدہ ہو جاتا ہے کہ کہیں عالمگیریت کا دیو استبداد اس کے پرخچے نہ اڑا دے۔ لیکن ہوائیں' فضائیں اور ماحول ابھی پابند سلاسل نہیں' ماحول کو تو مکدر یقیناً کیا جا سکتا ہے لیکن ہوائیں پھر بھی آزاد رہیں گی اور ان کے دوش پر آہیں' بکائیں اطراف عالم میں پھیلتی رہیں گی۔ یہ چاند' یہ سورج' یہ ستارے جو عالمگیریت کے نعرے تو بلند نہیں کرتے لیکن عالمگیریت پر یقین رکھتے ہیں' حیات انسانی کو مساوات' اخوت اور بھائی چارے کا درس دیتے رہیں گے۔ پھول اپنی خوشبو بکھیرتے رہیں گے' مفلوک الحال اور متمول میں حد فاصل قائم نہیں کریں گے۔ صبح اپنی روپہلی کرنوں سے جھونپڑیوں اور ایوانوں کو بیک وقت تازگی عطا کرتی رہے گی۔ شام کا سکون تھکی ہاری انسانیت کو بلا تخصیص فیض یاب کرتا رہے گا اور سب سے بڑھ کر وہ خلاقِ اعظم' وہ ذات بے ہمتا' وہ عظیم قوت' وہ عظیم جلال و جمال عالمگیریت کے پودے کی آبیاری کرتا رہے گا۔

بتانِ وہم وگمان

دیر و حرم آئینہ تقرار و تمنا
وا ماندگی شوق - تراشے ہے پناہیں

غالبؔ نے جانے کس نداز سے یہ بات کہی تھی لیکن یہ حقیقت ہے کہ ہم جانے کتنے خیالی اصنام تراشتے ہیں تا کہ ہمیں سکون مل جائے، یہی بات اقبالؒ نے اپنے انداز میں کہی تھی۔

یہ مال و دولتِ دنیا یہ رشتہ و پیوند
بتانِ وہم و گماں لا الہٰ اِلا اللہ

گویا سب کچھ محض ایک سراب ہے' دل کو خوش رکھنے کے لئے مختلف بہانے ہیں' سب کچھ وہم وگمان ہے لیکن عجیب بات یہ ہے کہ نہ ہم وہم وگمان کے بغیر جی سکتے ہیں اور اس کے ساتھ جینا بھی بہت مشکل ہے۔ ای۔ ایم فاسٹر نے کہا تھا کہ میں کسی شے پر عقیدہ نہیں رکھتا مگر عقیدے کے بغیر بات نہیں بنتی چاہے بروٹس نے سیزر کے سینے میں خنجر پیوست کر دیا ہو پھر بھی سیزر جیسے لوگ بروٹس کی تلاش مین رہیں گے' بھروسے کی تلاش میں رہیں گے۔ اعتماد کی بات کریں گے کیونکر بھروسہ کئے بغیر بات بنتی ہی نہیں۔ گویا اعتبار اور بے اعتباری زندگی کا لازمی حصہ ہیں۔ رسل نے اپنے مضامین میں اسی حقیقت کو ملحوظِ نظر رکھا ہے اور اسی کو

Coleridge نے Willing Suspension of Disbelief کہا ہے' یعنی ہماری آنکھیں مانیں یا نہ مانیں دل کی گواہی ضروری ہے۔ اگر دل جھوٹ کو سچ کہنے لگے تو ہمیں لبیک کہنا پڑے گا، اس کی توثیق کرنا پڑے گی۔ کیونکہ دل کا کہا ہمیشہ معتبر رہا ہے اور دل کا کفر بھی ایمان سے کم نہیں ہوتا۔ یہی وجہ ہے کہ بتانِ وہم و گمان کی بڑی اہمیت ہے اور ہمیں چیزوں پر' اشیاء پر' تو ہم پر بھروسہ کرنا ہی ہوتا ہے۔ ہمیں اپنے بھائیوں' رشتہ داروں' اپنی اولاد' اپنے ماں باپ کو اپنا سمجھنا ہی پڑتا ہے۔ حالانکہ زندگی میں اپنوں سے بڑے بڑے زخم سہے ہیں، لیکن اس کا کیا کیجئے کہ انسان ایک معاشرتی حیوان ہے وہ الگ تھلگ نہیں جی سکتا' وہ خیالی دنیا نہیں تراش سکتا بلکہ اسے اپنے اردگرد سے ہی زندگی کشید کرنا ہوتی ہے۔ وہ زندگی زہر ہو یا امرت' بس یہی زندگی ہے۔ ہم خوش فہمیوں کے تانے بانے بنتے رہتے ہیں اور خوب سے خوب تر کی تلاش میں جانے کہاں سے کہاں پہنچ جاتے ہیں۔ بات حوصلے کی ہے' ہمت کی ہے' دراصل انسان بیم اور امید کا اسیر ہوتا ہے۔ ایک طرف امید ہوتی ہے جو کہ اسے آگے بڑھاتی ہے اور دوسری طرف خوف جو اسے چوکنا رکھتا ہے۔ بس یہی زندگی ہے' ہم اندھیروں میں بھٹک رہے ہوتے ہیں' کچھ نہیں جانتے کہ آگے کیا ہونے والا ہے، لیکن پھر بھی ہمیں آگے بڑھنا ہوتا ہے۔ کیونکہ حرکت میں برکت ہے اور برکت میں زندگی ہے ورنہ انسان منجمد ہو کر رہ جائے' پتھر بن کر رہ جائے۔ بس ہم پتھر بننا نہیں چاہتے' ہم چاہتے ہیں کہ ہم پتھروں میں زندگی تراش لیں۔ اگر ایسا ہے تو پھر کیا گھبرانا' کیوں پریشان ہونا' کیوں ہچکچانا' منزلوں کی تلاش جاری رہنی چاہیے' سفر ختم نہیں ہونا چاہیے۔ نت نئی منزلیں ہمیں چلنے کا حوصلہ دیتی ہیں' آگے بڑھنے پر تیار کرتی ہیں' ہمیں قوت عطا کرتی ہیں اور یوں وہم و گمان ہمارے لئے حرکت کا باعث بنتے ہیں۔ اقبال نے تو ان کی تنسیخ کی تھی۔ کہا تھا ''اللہ کے سوا اور کچھ نہیں'' اور اس سے بڑا سچ اور کوئی ہو بھی نہیں سکتا لیکن یہ بھی سچ ہے کہ ہمیں سب کچھ معلوم نہیں' ہم کچھ نہیں جانتے کہ کل کیا ہونے والا ہے؟ ہم اس سے بے خبر ہیں اس لئے ہم

کبھی تخیل، کبھی تصور، اور کبھی وہم وگمان کا سہارا لیتے ہیں' انسان جو ہوئے' امید پہ جینا چاہتے ہیں' کبھی کسی دستک کے منتظر ہوتے ہیں' تو کبھی کسی آہٹ کے' کبھی کسی پیام کے' کبھی کسی نامہ بر کے۔ یوں اعتبار اور بے اعتباری زندگی کا حصہ بن جاتے ہیں۔ ہم جانتے ہیں کہ مال و دولتِ دنیا بے کار ہے اور رشتے بعض اوقات بے معنی ہو جاتے ہیں۔ لیکن ہم ان کے بغیر جی بھی نہیں سکتے' ایک لمحہ بھی جی نہیں سکتے' امید ہی تو ہمیں زندہ رکھتی ہے' توقع ہمیں حوصلہ دیتی ہے۔ آرزو زندگی عطا کرتی ہے اور یوں زندگی کا سفر جاری وساری رہتا ہے۔ غالب اور اقبالؒ دونوں نے اسی بات کو اپنے اپنے انداز میں بیان کیا ہے۔ وہ دونوں بہت بڑے شاعر تھے اور بہت بڑے انسان۔ ہم دونوں کو اپنا رہبر تسلیم کرتے ہیں اس لئے یہ چند حروف سپردِ قلم کر دیئے ہیں۔

وہیں پھر سجائی محفل

میں انسان کی آزادانہ فیصلہ کی قوت کا تو کبھی منکر نہیں ہو سکا اور نہ ہی یہ بات میرے دل و دماغ کو مطمئن کر سکی کہ انسانی اعمال و افعال کے فیصلے کہیں اور ہوتے ہیں' پہلے سے کر دیئے جاتے ہیں اور انسان تو بے چارہ ہے' بے بس ہے' مجبور ہے کیونکہ اس طرح میں اسلامی نظامِ حیات جس میں یومِ حساب کو بڑی اہمیت حاصل ہے کی تفہیم میں مشکلات محسوس کرتا ہوں۔ اگر ہم اپنے افعال کے ذمہ دار نہیں تو ان کی جزا اور سزا کے ذمہ دار کیونکر ہو سکتے ہیں۔ چھوڑ یئے! کہنا یہ چاہتا ہوں کہ جنوری فروری 2003ء میں میں سرگودہا سے لاہور منتقل ہونے کا جواز پیش کرتا رہا تھا۔ اس کے حق میں دلائل دیتا رہا تھا۔ لیکن پھر کچھ یوں ہوا کہ سرگودہا کی محبت اور اس سے ایک تعلقِ خاطر جیت ہی گیا لیکن اس میں کلام نہیں کہ سرگودہا سے لاہور میری منتقلی محبت کے پھیلاؤ کے سوا اور کچھ بھی نہیں تھی۔

ہم جو کہ عالمی گاؤں کے باسی متصور کئے جاتے ہیں ان کے نزدیک لاہور اور سرگودہا تو گویا قریب کے محلے ہوئے' قریب کے گلی کوچے ہوئے۔ لیکن پھر گلی کوچے بھی تو الگ الگ ہوتے ہیں۔ ایک گھر دوسرے گھر جیسا نہیں ہو سکتا۔ دیکھنے میں آیا ہے کہ بسا اوقات اپنے بستر کے سوا کسی اور بستر پر نیند نہیں آتی اور ایسا بھی ہے کہ

ہر مُلک مُلکِ ما است
کہ مُلک مُلکِ خدائے ما است

مصداق مشرق و مغرب سب اللہ کے ہیں اور سب مومن کی میراث ہیں، خیر ہم کہاں کے مومن ٹھہرے! گنہگار سے انسان ہیں لیکن اللہ کے ماننے والے ہیں اور اس کے

محبوب کے گرویدہ ہیں۔اس لئے کہہ سکتے ہیں کہ لاہور ہو کہ سرگودھا' دونوں ایک ہی ہیں۔ ایک ہی محبت کے شاخسانے ہیں۔ایک ہی چاہت کے چراغ ہیں۔

میں لاہور کسی Business Enterprise کے سلسلے میں منتقل نہیں ہوا تھا' میں سمجھتا تھا کہ لاہور میں معذورین کی بحالی کے سلسلے میں میں کوئی اہم کردار ادا کرسکوں گا اور وہاں علمی اور ادبی میدان کشادہ ہوں گے۔دونوں باتیں سچی ثابت ہوئیں اور میں نے حتیٰ المقدور اپنا کردار ادا کیا اور کرتے رہنے کے لئے مواقع تراشے۔یقین مانیے کہ لاہور نے مجھے اتنا پیار اور عزت دی کہ جب میں سوچنے لگتا ہوں تو کچھ ڈگمگا سا جاتا ہوں۔لاہور میں ''تھنکر ز فورم فار سوشل اپ لفٹ'' کی رجسٹریشن ہی بذاتِ خود ایک بڑی کامیابی تھی اور پھر نابینا حضرات کی تعلیم و تدریس کے لئے ایک ادارے کا قیام' انتظام و انصرام بڑا دل خوش کن عمل رہا۔مگر ایک خوشی یا اسے کامیابی کہہ لیجئے' غیر متوقع طور پر میری جھولی میں آن پڑی۔ وہ تھی پنجاب یونیورسٹی کے شعبہ خصوصی تعلیم سے میری وابستگی۔اس شعبے میں کوئی دو اڑھائی سال رہ کر میں نے بہت کچھ سیکھا' بہت کچھ پڑھا' بہت کچھ جانا۔کتنے پیار کرنے والے لوگ تھے جو وہاں موجود تھے۔طلباء و طالبات سراپا خلوص و محبت' اراکینِ سٹاف کے دل میرے لئے مثبت جذبات سے لبریز اور شعبہ کے چیئرمین پروفیسر ڈاکٹر حمید صاحب کا تعاون' محبت اور توقیر' شعبہ کے تمام احباب کا یہ خیال کہ وہ جو کچھ پڑھتے پڑھاتے ہیں میں اس کی جیتی جاگتی متحرک تصویر ہوں' میرے لئے ہمیشہ تقویت کا باعث رہے گا۔پنجاب یونی ورسٹی بالآخر پنجاب یونی ورسٹی ہے اس کے کسی بھی ادارے سے وابستگی اعتبار کی سند ہے۔چنانچہ یونی ورسٹی سے منسلک معذورین کے حوالے سے تمام اداروں نے مجھے ہاتھوں ہاتھ لیا۔مجھے موقع ملا کہ میں معذورین سے متعلق بہت ساری غلط فہمیوں کا ازالہ کرسکوں' معذورین کو ان کے اصل سیاق و سباق میں پیش کرسکوں۔خدا کا شکر ہے کہ ایک حد تک ایسا ممکن ہوا۔

علمی و ادبی حوالے سے میری خواہشات پھولی پھلیں اور مجھے محسوس ہوا کہ زندہ

دلانِ لاہور کے دل کتنے کشادہ ہیں۔ ان کے دل میں علم کی کتنی قدر ہے اور کتنی پیاس۔ جس علمی اور ادبی محفل میں مجھے جانے کا اتفاق ہوا' مجھے میرے تصور سے زیادہ محبت ملی' توقیر ملی۔ اس میں شک نہیں کہ میں نے بہت سے علمی اور ادبی دوست بنا لئے۔ لیکن شاہد بخاری صاحب اور رُوحی کنجاہی صاحب جیسے احباب کو میں کبھی بھلا نہیں پاؤں گا۔ یوں تو ہر صاحب علم نے میری بڑی حوصلہ افزائی کی' مجھے بہت نوازا۔ لیکن کچھ حضرات نے تو حد ہی کر دی۔ لاہور کے اخبار و جرائد بھی کسی سے پیچھے نہیں رہے۔ محترم اشفاق نقوی اور محترمہ صدیقہ بیگم کا میں بالخصوص سپاس گزار رہوں گا۔ کرم فرماؤں کی فہرست اتنی طویل ہے کہ یہ عرض داشت اس کی متحمل ہی نہیں۔ نابینا حضرات کی بحالی کے حوالے سے جانے کتنے احباب نے گراں بہا خدمات سرانجام دیں' میرا ہاتھ بٹایا اور مجھے یہ تصور دیا کہ بحالی کا یہ کام ان کا اپنا کام ہے اس ضمن میں جناب خادم حسین سندھو' پروفیسر ایس ایم شفیق' جناب اکرم خان جیسے احباب کو میں کبھی بھلا نہیں پاؤں گا۔ لاہور کی فلاح و بہبود کی تحریک ایسے احباب کے مدد و تعاون سے ہمیشہ جاری و ساری رہے گی۔ لاہور نے کچھ ماضی کے نقوش بھی شوخ رنگوں میں ابھارے۔ کالج کے دور کے احباب پھر اپنی محبتوں کے علَم لے کر میری پذیرائی کے لئے جگہ جگہ نظر آئے۔ اس میں میرے پیارے دوست کرنل مسعود الحق' عبدالباسط سہیل' میجر رشید اور خالد محمود وغیرہ شامل ہیں۔ ماضی کے دوستوں کا وہاں میلہ سا لگا تھا۔ سنتے آئے تھے کہ لاہور بہت مصروف ہے' کسی کے پاس وقت نہیں لیکن مجھے ایسا کوئی تجربہ نہیں ہوا۔ احباب ملنے آتے تھے تو وقت تھم جاتا تھا۔ بزمِ فکر و خیال کی محافل کا اپنا ہی رنگ تھا۔ الغرض لاہور میں قیام جواب بھی جاری ہے اور جاری رہے گا' میرے لئے تقویت کا باعث ہے۔ لاہور میں ایک ادارہ میری مادرِ علمی بھی ہے۔ میری مراد ہے ''گورنمنٹ انسٹی ٹیوٹ فار دی بلائنڈ شیراں والا گیٹ''۔ یوں تو لاہور میں نابینا احباب کی کوئی کمی نہیں تھی لیکن ان میں سے بہت سے اپنے مسائل اور مشکلات کے باعث کچھ سمٹے سمٹے سے رہے پھر بھی ان کی محبتیں مجھے حاصل رہیں۔

احبابِ گرامی! سرگودہا سے لاہور منتقلی کا میرے پاس کوئی ایسا جواز نہیں تھا جسے رد نہ کیا جا سکتا ہو۔ اسی طرح لاہور سے سرگودہا واپسی کا بھی میرے پاس کوئی تسلی بخش جواز نہیں ۔میرا خیال ہے کہ لاہور سرگودہا' سرگودہا لاہور میری دو محبتیں ہیں ۔ دونوں سے مجھے پیار ہے میری پہلی محبت لاہور ہے یا سرگودہا اس کا فیصلہ کرنا بھی بڑا مشکل ہے۔ کیونکہ طالب علمی کے دور میں میرے شعور کی آنکھ لاہور میں کھلی اور احساس و جذبات کی آنکھیں سرگودہا میں وا ہوئیں۔ ان نظاروں میں خوشاب اور فیصل آباد کے دل کش مناظر بھی ہیں۔ خوشاب کو تو میں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا (صرف جنہیں یار لوگ آنکھیں کہتے ہیں) لاہور اور سرگودہا کو اپنے پورے وجود سے محسوس کیا اور احساس کے سفر میں' میں فیصل آباد سے بھی گزرا اور جانے کہاں کہاں سے گزرنا ہے لیکن کچھ راستے بڑے روشن راستے ہوتے ہیں ۔ ان راستوں پہ چلنا کسی اچھے ہمسفر سے کم نہیں۔

منزلوں کی بات چھوڑو کس نے پائیں منزلیں
اک سفر اچھا لگا ، اک ہمسفر اچھا لگا

کب تک آخر، آخر کب تک

کوئی چلایا

تری ذات ہے سروری اکبری
مری بار کیوں دیر اتنی کی

کسی نے دہائی دی۔

کب ٹھہرے گا دردِ دل ، کب رات سحر ہو گی
سنتے تھے وہ آئیں گے ، سنتے تھے سحر ہو گی

کسی درد بھری آواز نے کہا ''TESS'' کا خدا کہاں تھا جب اس کی عزت لوٹ لی گئی''، کسی نے ہتھیار ہی گرا دیئے اور پکار اُٹھا''دیوتا ہمارے ساتھ وہی سلوک کرتے ہیں نا جو شریر بچے مکھیوں کے ساتھ کرتے ہیں''۔ کسی نے کہا''اگر مجھ سے خاکساری کا کام لینا تھا تو مجھے عقل ہی کیوں دی تھی۔''

جب انسان پر دکھوں کے پہاڑ ٹوٹتے ہیں، جب یاس کی بجلیاں آس کے خرمن پر گرتی ہیں، جب ہر طرف مسائل کا اژدہا پھنکار رہا ہوتا ہے، جب عدم توجہی اور بے پرواہی کے نشتر چل رہے ہوتے ہیں، جب بنتے بنتے بگڑ جاتی ہے، جب کوئی کشتی ساحل کے قریب آتے آتے موجوں کا لقمہ بن جاتی ہے، جب نشیمن بنتے ہی آگ کا رزق بن جاتا ہے، خاکستر ہو جاتا ہے، جب جام لبوں تک پہنچنے سے پہلے ہی چور چور ہو جاتا ہے تو پھر ایسے جذبے، ایسی سوچ اور ایسے خیالات ہی جنم لیتے ہیں جن کا حوالہ دیا گیا ہے۔ لیکن سوچنے کی بات یہ ہے کہ اس

المیے کا ذمہ دار کون ہے؟ کون ہے جو امیدوں کے ایوان زمین دوز کر دیتا ہے؟ کون ہے جو دلوں کی سلطنتوں کو تاراج کرتا ہے؟ کون ہے جو آس کے دیئے بجھا دیتا ہے؟ کون ہے جو ہر خوشۂ گندم کو سمیٹ لیتا ہے، ہر قطرۂ آب کو پی جاتا ہے؟ ہمیں معلوم ہے، شاید ہم جانتے ہیں لیکن لبوں تک نہیں لا سکتے، زبان کٹتی ہے، سامنے جلاد کھڑا ہو جاتا ہے۔

ہم نے چاہا تھا کہ حاکم سے کریں گے فریاد
وہ بھی کم بخت ترا چاہنے والا نکلا

وہ چاہنے والا بڑا شاطر ہے، وہ ظالم بڑا عیار ہے، اس نے کچھ بت تراش دیئے، کچھ صنم کدے آباد کیے، جن میں قسمت اور تقدیر کے لات ومنات رکھ دیئے اور سادہ لوح انسانوں کو ان کی پوجا پاٹ پر لگا دیا۔ وہ سوچنے لگے کہ یہ خوش ہوں گے تو لکشمی دیوی مہربان ہو گی۔ محبت کا دیوتا کوئی تیر ہماری جانب بھی پھینک دے گا۔ اصل ظالم کی پہچان کہیں گم ہو کر رہ گئی۔ ظالموں اور ستم گروں کو یہ ہنر ہاتھ لگ گیا اور سادہ لوح انسان اپنی سادہ لوحی میں سب کچھ بھول گئے ۔ اُنہیں دن دیہاڑے لُوٹا گیا تو وہ اسے اپنی قسمت سمجھ کر چپ ہو گئے۔ ان کے خون پسینے کی کمائی کوئی لے اڑا تو انہوں نے قنات کے بت کو پوجنا شروع کر دیا۔ اپنے محلات تعمیر کروا کر ہاتھ قلم کر دیئے تو لب نہ ہلے۔ قسمت میں یہی لکھا تھا، یہی ہونا تھا۔ سب جاگیرداروں، سرمایہ داروں اور آمروں کو یہ ہنر الٰہ دین کا چراغ لگا۔ وہ امیر سے امیر تر ہوتے چلے گئے، یہ غریب سے غریب تر۔ جب کچھ بھلے مانسوں کو یہ معلوم ہوا کہ یوں بھی چلتی ہے تو وہ پیر فقیر بن کر بیٹھ گئے، قسمتوں کے پروانے ہاتھوں میں تھمانے لگے اور خود دادِ عیش دینے لگے۔ ظلم کی ریت مستحکم ہو گئی، کسی کو بغاوت کی مجال نہ تھی، کسی نے بغاوت کی بھی تو اپنے منہ کی کھائی، ملیا میٹ ہو گئے، ان کا نشان تک باقی نہ رہا لیکن پھر بھی کچھ چنگاریاں جلتی رہیں اور کبھی وہ شعلۂ جوالہ بن گئیں۔ ایک چنگاری ریگزار عرب میں بھڑکی اور کفر کے خس و خاشاک کو جلا کر رکھ دیا اور بتایا کہ نہیں

تمہاری تقدیر تمہارے ہاتھوں میں ہے۔ کہا ''انسان کو وہی کچھ ملے گا جس کے لیے وہ تگ وتاز کرے گا۔'' بتایا ''خدا اس قوم کی حالت کبھی نہیں بدلتا جو اپنی حالت آپ نہ بدلتی ہو''

محسنِ انسانیت نبی اکرمؐ نے آقا و مولا کا تصور باطل قرار دیا۔ فرمایا سب انسان ہیں۔ کسی عجمی کو کسی عربی پر اور کسی عربی کو کسی عجمی پر، کسی کالے کو کسی گورے پر اور کسی گورے کو کسی کالے پر فوقیت حاصل نہیں۔ یہ چنگاری شعلہ بنی، بقۂ نور بنی۔ چہار دانگ عالم کو اپنے حصار میں لے لیا۔ دنیا امن کا گہوارہ بن گئی۔ نہ کوئی امیر رہا، نہ کوئی فقیر، سب ایک ہی رشتے میں منسلک ہو گئے۔ انسانیت کا رشتہ، محبت کا رشتہ، لیکن پھر کچھ چوہے نمودار ہوئے جنہوں نے ان مقدس رشتوں کو کاٹ دیا اور مذہب اسلام کی وہ تاویلات کیں کہ الامان الحفیظ۔ اقبال کا ابلیس بھی حیرت زدہ ہو گیا اور کہنے لگا۔

میں کھٹکتا ہوں دلِ یزداں میں کانٹے کی طرح
تو فقط اللہ ہو! اللہ ہو! اللہ ہو!

اور پھر چشم فلک نے دیکھا کہ مساوات و اخوت کا مذہب پھر آقا و غلام کی بات کرنے لگا۔ اسی مذہب کے ماننے والے خدا بن بیٹھے۔ دیوتا بن بیٹھے، تقدیر کے مالک بن بیٹھے،

رہے۔

اگرچہ بت ہیں جماعت کی آستینوں میں
مجھے ہے حکمِ اذاں لا اِلٰہ اِلا اللہ
عبث ہے شکوۂ تقدیرِ یزداں
تو تقدیرِ یزداں کیوں نہیں ہے

تعلیمات قرآنی کا نچوڑ یہ ہے کہ یہ دنیا جس میں ہم سانس لے رہے ہیں ایک امتحان گاہ ہے۔ ہمارے اعمال، ہمارے افعال اور ہمارا کردار ہمارے لیے سب کچھ ہے اور ہمیں اپنے ہر عمل کیلئے جواب دہ ہونا ہوگا۔ اگر ہم اپنے عمل کیلئے جواب دہ ہیں تو پھر یہ قسمت اور تقدیر کے اصنام کیا ہوئے؟ حقیقت یہ ہے کہ ہماری سیاہ رات کی صبح اس وقت تک ممکن نہیں جب تک کہ ہم اپنے آپ کو اپنے ہر عمل کے لیے جواب دہ نہیں سمجھتے۔ قرآن کریم ایک ایسی واضح کتاب ہے جو ہر ایک کے لیے اللہ کا پیغام ہے اور یہ اس وقت نازل ہوئی جب خواندگی کی اوسط صفر تھی اور اب جب کہ خواندگی کی شرح بڑھ چکی ہے اور پھر اللہ کا یہ حکم موجود ہے کہ یہ اللہ کی کتاب ہے جسے ہر کوئی سمجھ سکتا ہے تو پھر ہمارا تعلق براہ راست اوراقِ قرآن سے ہونا چاہیے اور اگر ایسا ہوتا ہے تو پھر فریب، مکاری، بے انصافی اور بد دیانتی کے سارے بت پاش پاش ہو جائیں گے۔ حقیقت یہ ہے کہ اللہ نے تو ہمیں سب کچھ دیا تھا لیکن ہم نے اپنے معصوم ارادوں کو عملی جامہ پہناتے ہوئے ایسا ہونے نہیں دیا۔ CISERO نے کہا تھا کہ ''انسان ہی انسان کا بدترین دشمن ہے''۔ اور یہ حقیقت آج تک قائم ہے۔ سینے میں دل رکھنے والا آدمی عنقا ہو گیا ہے۔

آدمی ہے نہ کہیں آدم زاد
آدمی آدمی کو چاٹ گیا

مصنف کی دیگر کتب

شاعری:

۱۔ساحلِ تشنہ لب ۲۔سوالیہ نشان

۳۔اک ہم سفر اچھا لگا ۴۔تلاوتِ دل

۵۔Love's no Crime

۶۔بیاضِ دل ۷۔یہ کافر دل نہیں مانا

تنقید:

۱۔جون ڈن، شخصیت اور شاعری

۲۔جون کیٹس شخصیت اور شاعری

۳۔اقبال، بحضور اقبال

نثر:

۱۔ذوقِ تماشا ۲۔دیدۂ دل

۳۔جہانِ مہ و پروین ۴۔کب رات بسر ہوگی



مصنف کے بارے میں میگزین کے خاص نمبرز

۱۔ ماہنامہ سفید چھڑی کا پروفیسر شیخ اقبال نمبر (جون، جولائی ۱۹۹۹ء)

۲۔ ماہنامہ سفید چھڑی کا پروفیسر ڈاکٹر شیخ اقبال کی نظم ونثر کا انتخاب نمبر
(اپریل، مئی، جون ۲۰۰۵ء)